قرآن فہمی بذریعہ کمپیوٹر

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی آواز میں

ترجمۂ قرآن اور دروسِ قرآن پر مشتمل دو کمپیوٹر CD تیار کر لی گئی ہیں

ترجمہ قرآن CD

قرآن مجید کا مکمل ترجمہ اور مختصر تشریح جامع متن قرآن

دورانیہ : 108 گھنٹے تعارفی قیمت : 175 روپے

الھدیٰ CD

مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے 44 دروس پر مشتمل کمپیوٹر CD

دورانیہ : 44 گھنٹے تعارفی قیمت : 175 روپے

پیشکش :

شعبہ سمع و بصر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون : 3-5869501 فیکس : 5834000

Email : aasif@brain..net.pk.

www.tanzeem.org.pk.

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۱۷ | جمادی الاخریٰ ۱۴۱۹ھ — اکتوبر ۱۹۹۸ء | شمارہ ۱۰

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بحری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

حرفِ اول

"حکمت قرآن" میں "لغات و اعرابِ قرآن" کی اشاعت کا سلسلہ دو ماہ قبل منقطع ہو گیا تھا۔ مضمون کے مرتب حافظ احمد یار مرحوم و مغفور کے انتقال کو اب ڈیڑھ برس ہونے کو ہے۔ اس عظیم علمی کام کو اپنی حیات میں انہوں نے جہاں تک پہنچایا تھا وہ "حکمت قرآن" کے اوراق میں محفوظ ہو چکا ہے' لیکن اس کے بعد اس کام کو انہی خطوط پر آگے بڑھانے والا کوئی باہمت اور باصلاحیت فرد تاحال سامنے نہیں آیا۔ "لغات و اعرابِ قرآن" کے عنوان سے شائع ہونے والا یہ سلسلۂ مضمون قرآن حکیم سے براہِ راست استفادے کے لئے ایک کلید کی حیثیت رکھتا ہے اور ان طالبانِ قرآن کے لئے جو قرآن حکیم کو ترجمے کی مدد سے نہیں' عربی زبان کے قواعد کی روشنی میں قرآن حکیم کے الفاظ' آیات اور تراکیب کا حقیقی مفہوم سمجھنے کے لئے کوشاں ہوں' یہ سلسلۂ مضمون ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔

ہمارے معاشرے میں ایسے عربی دان اور قرآن شناس افراد کی تعداد اگرچہ نہایت قلیل ہے جو اس علمی کام کو آگے بڑھانے کی صلاحیت اور استعداد رکھتے ہوں' تاہم ایسے لوگ ابھی بالکل معدوم نہیں ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کام شدید محنت اور توجہ کا متقاضی ہے۔ بہرحال' ہم اللہ کی رحمت سے نااُمید نہیں ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ جلد یا بدیر کوئی صاحب ہمت اس کام کا بیڑا اُٹھانے کے لئے ضرور سامنے آئے گا۔

زیرِ نظر شمارے میں حافظ احمد یار مرحوم کا ایک مضمون "کتابت مصاحف اور علمِ ضبط" شامل ہے۔ اس موضوع سے حافظ صاحب مرحوم کو خصوصی شغف تھا اور اس پر انہیں غیر معمولی عبور بھی حاصل تھا' بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ دورِ حاضر میں اردو زبان میں جو کام اس موضوع پر حافظ صاحب مرحوم نے کیا ہے اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ حافظ صاحب مرحوم کے پاس اس موضوع پر اتنا مواد تھا کہ اسے سمیٹ کر کتابی صورت میں مرتب کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کے لئے پر تول رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں "لغات و اعرابِ قرآن" کی جانب متوجہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ خدمت قرآن کے ان کاموں کو ان کے لئے توشۂ آخرت بنائے۔ آمین!

حقیقت ایمان (۷)

ڈاکٹر اسرار احمد کا سلسلۂ خطابات
مرتب : ابو عبد الرحمٰن شبیر بن نور

سابقہ بحث کے لازمی نتائج

- خوارج اور کرامیہ گمراہی کی انتہاؤں پر ہیں' کیونکہ : کرامیہ کے نزدیک صرف اقرار کافی ہے' نجات کے لئے نیک اعمال یا برے کردار کا کوئی دخل نہیں۔ دوسری انتہا پر خوارج ہیں۔ ان کے نزدیک جس سے گناہ کبیرہ سرزد ہوا وہ فوراً کافر' خارج از اسلام' واجب القتل اور حلال الدم والمال ہو گیا —— یہ دونوں مسلک شدید گمراہی میں مبتلا ہیں۔
- معتزلہ کا مسلک علمی اعتبار سے شدید مہمل اور بے بنیاد ہے۔ گناہ کبیرہ کا مرتکب ان کے نزدیک ایمان سے تو نکل گیا البتہ کفر میں داخل نہیں ہوا۔ گویا ان کے نزدیک اسلام اور کفر کے درمیان کوئی No Man's Land موجود ہے۔ حالانکہ اسلام و کفر کے درمیان کوئی تیسری منزل نہیں ہے' یا اسلام یا کفر' اِدھر یا اُدھر —— اس لئے میرے نزدیک علمی اعتبار سے معتزلہ کا موقف مہمل اور بے بنیاد ہے۔
- فقہاء احناف اور محدثین بشمول امام مالک' امام احمد بن حنبل اور امام شافعی رحمہم اللہ کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب دائرہ اسلام میں ہے' اس کا ایمان سلامت ہے۔ تاہم آخرت کا فیصلہ ایمان کے بعد اعمال صالحہ کے مطابق ہو گا —— یہی رائے عادلانہ و منصفانہ اور ہر دو طرح کے دلائل کو حاوی و شامل ہے۔

میرا مسلک اور وضاحت

اب میں اپنا مسلک بیان کر رہا ہوں' لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ بعض حضرات

نے (میرے شدید احتجاج کے علی الرغم) مجھے خوارج اور معتزلہ سے جوڑ دیا ہے۔ اور میں قسمیں کھا کھا کر کہتا ہوں کہ :

میرا عقیدہ ہرگز نہیں ہے کہ : "گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو گیا ہے"

اور نہ ہی میں یہ سمجھتا ہوں کہ :

"وہ ایمان اور اسلام دونوں سے نکل گیا ہے"

البتہ یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ :

"وہ دائرۂ ایمان سے نکل کر دائرہ اسلام میں رہ گیا ہے"(۱۷)

جب وہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر رہا تھا تو تصدیق بالقلب والی بات نہیں تھی، مگر چونکہ اقرار باللسان موجود ہے لہٰذا وہ دائرہ اسلام میں شامل رہے گا۔

ایک مشکل اور اس کا حل

جن آیات قرآنی یا احادیث میں بد عملی یا گناہوں کی بنیاد پر ایمان کی نفی کی گئی ہے یا خلود فی النار (ہمیشہ آگ میں رہنا) کی وعید آئی ہے، جب آپ ان کی ترجمانی کریں گے تو ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ کہیں کہ : "اس میں کمال ایمان کی نفی ہے، نفس ایمان کی نفی نہیں ہے۔"

اس ترجمے سے لوگوں کے لئے ترہیب، انذار، خوف اور دھمکی کا عنصر ختم ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک نصوص قرآنی و احادیث کو ان کے اصلی الفاظ کے ساتھ باقی رکھنا چاہئے۔ البتہ حاشیہ میں یہ وضاحت آ جائے کہ اس سے مراد ایسا کفر نہیں ہے جو حدود اسلام سے نکال کر حدود کفر میں داخل کر دیتا ہے۔

مثلاً حدیث کے الفاظ ملاحظہ کریں : وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ ـــــ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ ـــــ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ ـــــ "خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہے، قسم بخدا وہ شخص مومن نہیں ہے، اللہ کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہے"۔ تصور کیجئے کہ سننے والا انسان کانپ اٹھے گا۔

دوسرا ترجمہ ملاحظہ کریں :

"خدا کی قسم وہ شخص حقیقی مومن نہیں ہے' خدا کی قسم اس کا ایمان کامل نہیں ہے' اللہ کی قسم اس شخص کے پاس کمال ایمان نہیں ہے"۔ ذرا غور کریں کہ سننے والے پر ذرا اثر بھی نہ ہو گا۔ وہ دل میں خیال کرے گا کہ کمال ایمان تو بڑی دُور کی چیز ہے' ہمیں تو ٹارچ والا ایمان مل جائے تو بہت غنیمت ہے۔ اس کے بعد کون آدمی دین کی خاطر قربانی دے گا اور کون عیش و عشرت چھوڑ کر کانٹوں بھری راہ کا انتخاب کرے گا۔

دوسری طرح ترجمہ کرنے سے ترہیب و تخویف کا سارا زور ختم ہو گیا۔ یہی بات مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ العالی نے اپنی معرکۃ الآراء تالیف "معارف الحدیث" جلد اول میں لکھی ہے کہ "اس قسم کی احادیث کی نحوی ترکیب میں تامًا یا کاملاً جیسے الفاظ مقدر ماننے (Understood) کی بالکل ضرورت نہیں ہے' بلکہ ایسا کرنا ایک قسم کی بدذوقی ہے۔

میں تو ایک قدم آگے بڑھا کر یہ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک یہ ﷺ کی توہین ہے۔ کیا نبی اکرم ﷺ کو (معاذ اللہ) عربی نہیں آتی تھی؟ کیا آپؐ اپنے مافی الضمیر کو بیان نہیں کر سکتے تھے؟ کیا آپؐ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ میں کمال ایمان کی نفی کر رہا ہوں حقیقی ایمان کی نفی نہیں کر رہا' جبکہ آپؐ نے کمال ایمان کو مثبت انداز میں بیان فرمایا ہے :

﴿ مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ ﴾ (۱۸)

"جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے کی' اور عداوت (دشمنی) رکھی تو اللہ کے لئے رکھی' کسی کو کچھ دیا تو اللہ کے لئے دیا اور کسی سے کچھ روکا تو اللہ کے لئے روکا' اس شخص نے اپنے ایمان کو کامل کر دیا"۔

جب مثبت معنی میں "استکمل" کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے تو منفی معنی میں بھی اس لفظ کو استعمال کرنا آپ ﷺ کے لئے مشکل یا محال نہ تھا۔ آپؐ تو افصح العرب ہیں۔

ذرا غور کریں کہ آپ ﷺ تو فرما رہے ہیں : وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ـــــ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ـــــ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ' تاکہ لوگ لرز اُٹھیں' کانپ جائیں ـــــ ہوش میں آ جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ بے شعوری میں کسی کا طرز عمل ایسا ہو' اس سے غلطی سرزد ہو رہی ہو اور یہ

الفاظ سن کر وہ فوراً چونک جائے' اپنے گریباں میں جھانکے اور اپنا محاسبہ کرے کہ کہیں ان الفاظ کا مصداق میں تو نہیں بن رہا۔ لہٰذا اس قسم کی آیات واحادیث کا ترجمہ کرتے وقت ان کے الفاظ پر قائم رہنا چاہئے' البتہ حاشیہ میں یا کسی مناسب جگہ پر وضاحت کردی جائے کہ یہاں ایمان کی نفی ہو رہی ہے' اسلام کی نفی نہیں ہو رہی ـــــ اس مضمون کو ہم آگے چل کر تفصیل سے بیان کریں گے' لیکن یہاں صرف ایک مثال دیکھ لیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴾ (النساء : ۹۳)

"اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے (۱) اس کا بدلہ جہنم ہے (۲) وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہے گا (۳) اللہ کا غضب اس پر ہے (۴) اور اللہ کی لعنت اس پر ہے (۵) اور اللہ نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

اس آیت کو پڑھ کر ہوش ٹھکانے آجاتے ہیں جس طرح کہ مذکورۃ الصدر حدیث میں وارد الفاظ : وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ـــــ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ـــــ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ کو سن کر انسان کانپ اُٹھتا ہے۔ ذرا غور کریں کہ ڈرانے' دھمکانے' ترہیب اور لرزانے کے جس قدر اسلوب ممکن تھے سارے کے سارے اس آیت میں جمع ہو گئے ہیں۔ الفاظ پر دوبارہ غور فرمائیں : فَجَزَآءُهٗ جَهَنَّمُ (اس کا بدلہ جہنم ہے) خَالِدًا فِيْهَا (وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہے گا) وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ (اور اس پر اللہ کا غضب ہے) وَلَعَنَهٗ (اور اس پر اللہ کی لعنت ہے) وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (اور اس کے لئے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے)۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع[۱۹] نے آیت کی ترجمانی کرتے ہوئے بریکٹ میں اضافہ کرکے جو عبارت بنائی ہے وہ کچھ یوں ہے :

"اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کرڈالے تو اس کی (اصلی) سزا (تو) جہنم (میں اس طرح رہنا) ہے کہ ہمیشہ ہمیش اس میں رہے گا۔ (لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ یہ اصلی سزا جاری نہ ہوگی' بلکہ ایمان کی برکت سے آخر نجات ہو جائے گی) اور اس پر (ایک معیاد معین تک کے واسطے) اللہ تعالیٰ غضبناک ہوں گے'

اور اس کو اپنی رحمت (خاصہ) سے دور کریں گے اور اس کے لئے بڑی سزا (یعنی سزاء دوزخ) کا سامان کریں گے۔"

ذرا غور کریں کہ فقیہانہ احتیاط کی وجہ سے مذکورہ آیت میں جو اسلوب ترجمانی اختیار کیا گیا ہے اس کو پڑھ کر کسی کے دل میں ذرا خوف، گھبراہٹ یا چنتا پیدا ہوگی؟ اس پر لرزہ طاری ہوگا؟ ـــــ میرا موقف یہ ہے کہ فتوے کے اعتبار سے حضرت مفتی صاحب کا موقف صد فی صد درست ہے۔ اگر دل میں ایمان ہے تو واقعتاً جہنم میں خلود (ہمیشگی) نہیں ہوگا، وہ سزا پا کر بالآخر نکل آئے گا۔ اس مسئلے کو علیحدہ کتابچے کی شکل میں شائع کر کے لوگوں میں عام کر دیا جائے، البتہ اس آیت کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ سارے اضافے کر کے اس کی تاثیر کو ختم نہ کیا جائے۔

بزرگوں کے اعتراضات اور میرا موقف

"راہ نجات سورۃ العصر کی روشنی میں" میرا معروف کتابچہ ہے۔ ہمارے شہر کے معروف مفتی مولانا جمیل احمد تھانوی صاحب نے میری اس تحریر پر ستر کے قریب اعتراضات وارد کر دیئے۔ ان کا فرمان تھا کہ میری اس تحریر سے تو ایمان ہی کی نفی ہو جاتی ہے۔ میں نے جناب کی بات کا زیادہ نوٹس نہیں لیا۔ اس کے بعد میرا یہی کتابچہ، جو صدیقی ٹرسٹ کراچی نے شائع کیا تھا اور اس میں کتابت کی بھی بے شمار غلطیاں تھیں، کسی نے مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ان کے اواخر عمر میں نشان زد کر کے پیش کر دیا۔ اسے دیکھ کر مولانا مرحوم نے فرمایا کہ یہ موقف صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ اس وقت سے میں نے اس کتابچے کے کور پر درج ذیل تحریر کی اشاعت کا اہتمام کیا کہ :

"اس کتابچے پر بعض بزرگوں نے گرفت فرمائی ہے کہ اس کی بعض عبارات سے عاصی اور گناہ گار اہل ایمان کے اپنے گناہوں کے بقدر سزا پانے کے بعد جہنم سے رہائی پانے کی نفی ہوتی ہے۔ میں اس سے براءت کرتا ہوں۔ میری رائے بھی یہی ہے کہ جس مسلمان کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا وہ بالآخر جہنم سے نجات پا جائے گا۔ اس کتابچے میں جہاں جہاں لفظ نجات آیا ہے اس سے مراد "اول مرحلے میں نجات" ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کو جہنم میں بالکل ڈالا ہی

نہ جائے اور میدان حشر ہی میں رحمت و مغفرت خداوندی اس پر سایہ فگن ہو جائے ـــــ مزید برآں اس کتابچے کی زبان قانون اور فتوے کی نہیں بلکہ ترغیب و ترہیب کی ہے ـــــ ورنہ میرا موقف بھی وہی ہے جو امام اعظم امام ابو حنیفہؒ کا ـــــ یعنی گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے بھی کوئی شخص کافر نہیں ہوتا بلکہ مسلمان ہی رہتا ہے!"

اشکالات کا آسان حل

اہل سنت کے موقف کی عام فہم تعبیر کیا ہے؟ اس کے لئے چار نکات پر غور کرلیں تو بات واضح ہو جائے گی۔

۱۔ ایمانِ مطلوب :

تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان ایمان مطلوب کے دو اہم حصے ہیں۔

۲۔ قانونی ایمان :

ظاہری، خارجی اور قانونی ایمان کا دار و مدار قول پر ہے اور یہی دنیا میں معتبر ہے۔ اس درجے میں عملی ایک جداگانہ وجود بن جاتا ہے۔ اِلا یہ کہ کوئی انسان ایسا عمل کرے جو کھلم کھلا کفر یا شرک کا درجہ رکھتا ہو[۲۰] ورنہ عام کبائر کا معاملہ علیحدہ رہے گا۔ اس طرح عمل علیحدہ رہے گا اور ایمان علیحدہ رہے گا ـــــ اور اسی ظاہری و قانونی شکل کا نام اسلام[۲۱] ہے جس کا سب سے بڑا رکن زبان سے شہادتین کا اقرار کرنا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے :

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ : شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكَاةِ وَحَجِّ الْبَيْتِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ[۲۲]

"اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر رکھی گئی ہے : (۱) لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دینا (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوٰۃ ادا کرنا (۴) بیت اللہ کا حج کرنا (قرآن و حدیث میں استطاعت کی شرط کے ساتھ ہے۔) اور (۵) رمضان کے

روزے رکھنا۔"

۳۔ حقیقی ایمان :

حقیقی ایمان قلبی ایمان ہے۔ آخرت میں حساب کتاب اور فیصلوں کا دارومدار اسی حقیقی ایمان پر ہے۔ اس مرحلے پر اعمال صالحہ ایمان کا جزو بن جاتے ہیں کیونکہ یقین موجود ہو اور عمل موجود نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے؟ اس موضوع کو مزید تفصیل اور دلیل سے دیکھنے کے لئے میرا معروف کتابچہ : "راہ نجات سورۃ العصر کی روشنی میں" ضرور مطالعہ فرما لیں۔

۴۔ کمال ایمان :

کمال ایمان کے لئے اسلام کے بعد ایمان اور پھر درجہ احسان مطلوب ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء میں فرمایا :

﴿ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ﴾ (النساء : ۱۳۶)

"اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر' اور اس کے رسول پر' اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے نازل فرمائی' اور جو شخص کفر کرے اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتابوں کے ساتھ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور آخرت کے دن کے ساتھ تو وہ شخص بہت دور کی گمراہی میں نکل گیا۔"

آیت مذکورہ میں خطاب مومنوں سے ہے اور انہیں کہا جا رہا ہے کہ ایمان لاؤ۔ مثلاً ایک شخص ہندو' عیسائی یا پارسی تھا اس نے جونہی کلمہ پڑھا وہ قانوناً مسلمان ہو گیا۔ ایسے شخص سے کہا جا رہا ہے اس پر اکتفا نہ کرو' اصل ایمان تو تب ہو گا جب یہ دل میں داخل ہو گا۔ اس اصل ایمان کو حاصل کرنے کی فکر کرو' اور یہی آخرت میں کام آئے گا۔ آگے چل کر سورۃ المائدہ میں فرمایا :

﴿ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ (المائدہ : ۹۳)

"نہیں ہے ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے کوئی گناہ یا حرج اس چیز میں جو انہوں نے کھایا پیا جبکہ انہوں نے تقویٰ اختیار کیا' پھر اور ایمان لے آئے پھر اور تقویٰ اختیار کیا' پھر اور ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کیا' پھر وہ درجہ احسان پر فائز ہو گئے' اور اللہ تعالیٰ محسنین کو پسند فرماتا ہے"(۲۳)

سورۃ النساء آیت ۱۳۶ میں فرمایا گیا تھا :

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴾

معلوم ہوا ایمان کے دو درجے ہیں' پہلے درجے میں عمل صالح علیحدہ شے ہے۔ دوسرے درجے میں (یعنی قلبی ایمان والے درجے میں) عمل ایمان کا جزو بن گیا۔ لہٰذا آیت میں لفظ "عمل" کی تکرار نہیں کی گئی۔

نوٹ : یہاں یہ بات نوٹ کرلیں کہ عمل صالح جن لوگوں کے ایمان کا جزو بن چکا اور پھر انہوں نے مزید تقویٰ اختیار کیا تو اس طرح وہ لوگ درجہ احسان تک پہنچ گئے۔

حدیث جبریلؑ میں اسلام' ایمان اور احسان کا فرق واضح کیا گیا ہے اور یہ حدیث اُم السنۃ کہلاتی ہے۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں ہے اور حضرات عمرؓ' عبداللہ بن عمرؓ' عبداللہ بن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔

اسلام :

حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا(۲۴) اَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِسْلَامِ (مجھے اسلام کے متعلق بتلائیں) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ

الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً))

"اسلام یہ ہے کہ تم لاالٰہ اِلا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دو (یہاں شہادت کا لفظ ہے ایمان کا نہیں) نماز قائم کرو' زکوۃ ادا کرو' رمضان کے روزے رکھو اور اگر (جانی و مالی) استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔"

نوٹ کرلیں کہ اس عبارت میں ایمان کا لفظ استعمال نہیں ہوا کیونکہ یہاں یقین والی بات نہیں ہے بلکہ ظاہری اطاعت والی بات ہے۔

ایمان :

جبریل علیہ السلام نے دریافت کیا : اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ (مجھے ایمان کے متعلق بتلائیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ))

"یہ کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر' اس کے فرشتوں پر' اس کی کتابوں پر' اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر' اور یہ کہ تم ایمان لاؤ اچھی بری تقدیر پر۔"

احسان :

حضرت جبریل علیہ السلام نے دریافت کیا : اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ (مجھے احسان کے بارے میں بتلائیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) (۲۵)

"(احسان یہ ہے) کہ تم اللہ کی عبادت اس کیفیت کے ساتھ کرو گویا کہ تم بچشم خود اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر خود دیکھنے والی کیفیت پیدا نہیں ہوتی (تو کم از کم یہ کیفیت ضرور ہو کہ) اللہ تو تم کو دیکھ رہا ہے"۔

جب ایمان کی کیفیت اس شدت کو پہنچ جائے تو وہ احسان بن جاتا ہے۔

زیر نظر حدیث جبریل علیہ السلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ یہ تین درجے ہیں : اسلام

ـــــ ایمان ـــــ احسان۔ اور سورۃ المائدہ کی آیت ۹۳ کے مطالعے سے ہم معلوم کر چکے ہیں کہ ایمان' پھر ایمان' پھر احسان۔ تو معلوم ہوا کہ پہلے ایمان سے مراد اسلام ہی ہے۔ یعنی قانونی ایمان' پھر حقیقی ایمان' پھر گہرا اور راسخ ایمان یعنی احسان۔ اس موضوع کو مزید تفصیل بلکہ گہرائی سے جاننے کے لئے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ سے واضح راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ فرمایا :

﴿ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا' قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ' وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا' اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

"یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ اے نبی ان سے کہہ دیجئے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (یا ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ البتہ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کرے گا' بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے"

انہی حقائق کی روشنی میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "الایمان" میں ایک فصل کا نام ہی ان الفاظ میں تجویز کیا ہے "وقد اثبت اللہ فی القرآن اسلاماً بلا ایمان" اور سورۃ الحجرات کی محولہ بالا آیت بطور دلیل پیش کی ہے۔ سابقہ دلائل کی روشنی میں نتیجہ یہ نکلا کہ ظاہری اور قانونی ایمان کا نام اسلام ہے ـــــ دل کی گہرائی اور تصدیق بلاریب سے حاصل ہونے والا ایمان "حقیقی ایمان" ہے ـــــ اور ایمان کی گہرائی اور شدت جو ہر آن انسان کے اعمال پر اثر انداز ہو کر خشیت الٰہی کا مظہر بنے وہ کامل و مکمل ایمان یا بالفاظ دیگر احسان ہے۔

غلطی....اعتراف....اصلاح

ایمان کی تعریف کے ضمن میں مجھ سے کئی موقعوں پر ایک غلطی سرزد ہوئی ہے جس کا میں برملا اعتراف کرنا چاہتا ہوں تاکہ میرے حوالے سے غلط بات نقل نہ کی جائے۔ ہوا

یوں کہ میں نے امام ابو حنیفہ اور امام بخاری رحمہما اللہ کے موقف کا آپس میں تقابل کرتے ہوئے کہا کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک : "الایمان قولٌ" ہے اور امام بخاری کے نزدیک : "الایمان قولٌ و عملٌ" ہے۔ اس پر ماہنامہ "بینات" کراچی میں گرفت کی گئی کہ میں نے امام ابو حنیفہ کے موقف کو صحیح بیان نہیں کیا' کیونکہ امام موصوف کے نزدیک ایمان کی صحیح اور مکمل تعریف یہ ہے : ـــــ "الایمان تصدیقٌ و اقرارٌ" ـــــ میں اس لفظی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی اصلاح کرتا ہوں اور جن حضرات نے میری تقریر یا تحریر میں یہ غلطی پائی ہو وہ بھی اصلاح فرمالیں۔

ایک وضاحت

اپنی غلطی کا برملا اعتراف اور اعلانِ اصلاح کے بعد ایک بات کی طرف توجہ مبذول کروانا ضروری سمجھتا ہوں کہ :

(۱) تصدیق قلبی دنیا میں ہماری تفتیش کا موضوع بن ہی نہیں سکتی کیونکہ اس کا فیصلہ تو آخرت میں ہوگا۔ چنانچہ دنیا کے اعتبار سے تو زیر غور قول یا اقرار ہی باقی رہ گیا۔

(۲) جب امام ابو حنیفہ اور امام بخاری رحمہما اللہ کی آراء کے درمیان تقابل ہو رہا ہو تو گفتگو باعث اختلاف نکتے پر ہوگی۔ اور اختلاف تصدیق پر نہیں ہے' بلکہ امام ابو حنیفہ صرف قول کو کافی قرار دیتے ہیں جبکہ امام بخاری و دیگر محدثین قول پر عمل کا اضافہ بھی کرتے ہیں۔

اس اعتبار سے برائے تقابل ہماری بات غلط نہ تھی ـــــ اس کے باوجود میں نے اپنی لفظی غلطی کا اعتراف کرکے اصلاح کا اعلان کیا ہے۔

حوالہ جات' حواشی و تعلیقات

(۱۷) محترم ڈاکٹر صاحب کا مسلک "عقیدۂ اہل سنت و جماعت" (بشمول فقہاء احناف اور محدثین) سے مختلف ہے۔ اگر جناب ڈاکٹر صاحب اس جملے میں یہ ترمیم قبول کرلیں کہ : "گناہ کبیرہ کا مرتکب جس وقت گناہ کر رہا ہوتا ہے اس گھڑی اس کا ایمان اس کے سر پر معلق ہوتا ہے اور جب وہ گناہ سے باز آجاتا ہے تو اسی وقت اس کا ایمان واپس آجاتا ہے" تو ڈاکٹر صاحب کا مسلک عقیدہ

اہل سنت کے عین مطابق ہو جائے گا۔ ورنہ ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور اس کتاب کا مرتب و حواشی نویس جناب محترم ڈاکٹر صاحب کے شدید احترام کے باوجود ان کے عقیدے سے اعلانِ براءت کرتا ہے اور عقیدہ اہل سنت و جماعت کی علیٰ وجہ البصیرۃ والبراہین تائید کرتا ہے اور اسی پر موت کی اللہ سے دعا کرتا ہے۔

(۱۸) سنن ابی داؤد کتاب السنہ باب الدلیل علی زیادۃ الایمان ح ۴۶۸۱ و مسند احمد ۴۳۸/۳ (بروایت ابوامامہ الباہلی رضی اللہ عنہ) دوسری روایت میں حضرت معاذ بن انس الجہنی سے ہے: سنن الترمذی کتاب صفۃ القیامہ باب ۶۱، ح ۲۵۲۳۔ علامہ الالبانی نے تحقیق سنن ابی داؤد میں حدیث کو صحیح کہا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ ۱/ ۶۵۷، ح ۳۸۵۔

(۱۹) جناب مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کا میں بہت احترام کرتا ہوں۔ آپ کی فقاہت، تدین، تقویٰ سب کچھ مسلم ہے۔ میں ان کے قریب رہا ہوں، کچھ عرصہ تک کورنگی میں ان کے دارالعلوم کے قریب میری رہائش رہی ہے، گھریلو مراسم بھی تھے، بہت شفقت فرماتے تھے۔ (ماخوذ)

(۲۰) اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔

(۲۱) ذرا غور کریں کہ اسلام صرف اقرار کا نام نہیں بلکہ حدیث میں موجود وہ پانچ اعمال کے مجموعے کا نام ہے۔ پھر اسلام کے نام پر اعمال کو ایمان سے علیحدہ کرنے کا کیا مطلب؟ اس فکر کا نتیجہ ہے کہ ہر کلمہ گو اپنے آپ کو مکمل مسلمان بلکہ کامل مومن سمجھ کر عمل سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ (اضافہ از مرتب)

(۲۲) صحیح بخاری کتاب الایمان باب ۱، ح ۸ و صحیح مسلم کتاب الایمان باب بیان ارکان اسلام ح ۱۶

(۲۳) اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جب شراب کی حرمت کا آخری حکم آیا تو بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تشویش لاحق ہو گئی کہ ہم تو عرصے سے شراب پیتے جا رہے ہیں، شراب تو ہمارے وجود میں رچ بس گئی ہے، تو اب ہمارا کیا بنے گا؟ اس تشویش کو ختم کرنے کے لئے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تاکہ اہل ایمان کو اطمینان خاطر حاصل ہو جائے اور ساتھ ہی آیت کے دوسرے حصے میں ایمان، عمل صالح اور احسان کے باہمی ربط و تعلق کو واضح کر دیا۔ (ماخوذ)

(۲۴) صحیح بخاری کتاب الایمان باب ۳۶ ح ۵۰ و صحیح مسلم کتاب الایمان باب ۱ ح ۹، مختلف سندوں کے ساتھ (بروایت ابوہریرہ) و صحیح مسلم ح ۸ (بروایت عمر) باقی صحابہ کی روایات دیگر کتب حدیث میں موجود ہیں ملاحظہ ہو جمع الفوائد ج ۱، ص ۹ اور بعد

(۲۵) اس حدیث کی مختلف روایات میں کچھ دوسرے الفاظ روایت ہوئے ہیں، انہیں بھی سمجھ لینا

چاہئے۔ قال: ان تخشی اللہ کانک تراہ...الخ (صحیح مسلم ح ۱۰' عن ابی ہریرہ) "یہ کہ تم اللہ سے اس طرح ڈرو جیسے کہ خود اسے دیکھ رہے ہو" دوسری روایت میں ہے: "ان تعمل للہ کانک تراہ" (مجمع الزوائد ۱/۱۹۱ ح ۱۱۲' بروایت عبداللہ بن عباس) "یہ کہ تم اللہ کی خاطر کام کرو تو اس طرح کرو جیسے کہ تم خود اسے دیکھ رہے ہو"۔

انسانیت کے نجات دہندہ

عرب جب دنیا کو فتح کرنے کے لئے نکلے ہیں' بلکہ انسانیت کا نجات دہندہ بن کر نکلے۔ اس مقصد سے نکلے کہ انسانیت کو وحشت و بربریت کے چنگل سے چھڑائیں اور انسانیت کو اس ظلم و جور سے نجات دلائیں جو صدیوں سے جاری تھا۔ وہ جب لوگوں کو بندوں کی عبادت سے نکال کر خدائے واحد کی عبادت و اطاعت کی طرف بلانے کے لئے نکلے' دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت کی طرف لانے کی غرض سے نکلے' ادیان و مذاہب کے ظلم و جور سے نکال کر اسلامی عدل و انصاف کی طرف بلانے کے مقصد سے نکلے تو یہ بے روح جاہ و جلال ان کو ہیچ نظر آئے' بڑی بڑی حکومتیں ان کو کٹھ پتلی کا کھیل معلوم ہوئیں' ان کے جھنڈوں کو سرنگوں کرنا بچوں کا کھیل معلوم ہوا' آسمان سے باتیں کرنے والی فلک بوس عمارتیں ان کو خس و خاشاک کا ایک تودہ معلوم ہوتیں' بڑے بڑے لشکر ان کو بھیڑ بکری کا گلہ معلوم ہوتے' انہوں نے ان کو غیر عاقل اور بے شعور جانور سمجھا جس میں نہ رحم و کرم کا مادہ ہے' نہ لطف و مہربانی کا جذبہ' وہ انہیں انسانوں کی شکل میں بھیڑیئے اور درندے نظر آئے۔

قرآن پاک نے ان آن پڑھ عربوں کو' قافلۂ حیات سے بچھڑے ہوئے عربوں کو' تہذیب و تمدن سے ناآشنا عربوں کو' قوت و طاعت اور حوصلہ سے بردیا۔ انہوں نے ان کے سرد اور خالی دلوں کو اس نعمت عظمیٰ پر فخر و ناز' خود اعتمادی و خود شناسی اور رفعت و بلند پروازی کے نئے "سیل" اور نئے مسالہ سے بھر دیا۔ اس نے ان اشیاء کے خواص و اثرات کو جاننے کا ملکہ عطا کیا' وہ ان ساری توانائیوں سے مالا مال ہو کر نکلے اور سارے عالم کو زیر کر لیا' اس لئے نہیں کہ وہ اس کے مالک بن جائیں' نہ اس لئے کہ اس پر حکومت و فرمانروائی کریں' جیسا کہ ان قوموں نے کیا تھا' بلکہ وہ اس لئے نکلے تھے کہ گم کردہ راہ اور در در کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی انسانیت کو خدائے واحد کے سامنے جھکائیں اور اسے اسلامی عدل و انصاف کے سائے میں لائیں۔

(ماخوذ از نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں' مولف : ابوالحسن علی ندوی)

ڈاکٹر اسرار احمد

اِلَیْہِ یُرَدُّ (۲۵)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ اِلَیْہِ یُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَۃِ ؕ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَکْمَامِہَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِہٖ ؕ وَیَوْمَ یُنَادِیْہِمْ اَیْنَ شُرَکَآءِیْ قَالُوْٓا اٰذَنّٰکَ مَا مِنَّا مِنْ شَہِیْدٍ ۝ ﴾

(حٰمٓ السجدۃ : ۴۷)

قرآن مجید کا پچیسواں پارہ "اِلَیْہِ یُرَدُّ" کے نام سے موسوم ہے اور اس میں اولاً سورۂ حم السجدۃ کی آخری آٹھ آیات شامل ہیں اور اس کے بعد سلسلۂ حوامیم کی چار کامل سورتیں، یعنی سورۃ الشوریٰ، سورۃ الدخان، سورۃ الزخرف اور سورۃ الجاثیہ۔ سورۃ الشوریٰ کا دوسرا رکوع بلاشبہ نہایت عظمت اور اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں اولاً اس حقیقت کی طرف راہنمائی کی گئی کہ نبی اکرم ﷺ جو دین لے کر دنیا میں تشریف لائے وہ کوئی نیا نویلا دین نہیں بلکہ یہ وہی دین ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو دیا گیا تھا اور جو حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام لے کر دنیا میں تشریف لائے، اور اس دین کے دنیا میں آنے کی اصل غرض یہی ہے : ﴿ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ ﴾ (الشوریٰ : ۱۳) کہ جو بھی اس دین کو قبول کریں یا جو بھی اس کے ماننے کے اور اس کے حامل ہونے کے دعویدار ہوں، ان کا فرض ہے کہ وہ اس دین کو قائم کریں اور اس میں تفرقے پیدا نہ کریں۔ یہ دین کُل کا کُل ایک وحدت ہے، اس میں تفریق نہیں کی جا سکتی اور سب سے بڑا فتنہ جس میں امت مبتلا ہو سکتی ہے وہ یہی تفرقہ کا فتنہ ہے۔

اس کے بعد وضاحت فرمائی کہ رسولوں کی امتوں میں اضمحلال یا زوال عمل کیوں پیدا ہوتا ہے۔ فرمایا : ﴿ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْکِتٰبَ مِنْ بَعْدِھِمْ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ○ ﴾ (آیت ۱۴) وہ لوگ کہ جو نبیوں کے بعد ان کی کتابوں کے وارث ہوتے ہیں وہ ان کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں' اور یہی ان کی بے عملی اور پھر بد عملی کا اصل سبب بنتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کو حکم ہوا' اور یہ حکم آپؐ کی وساطت سے پوری اُمت مسلمہ کے ایک ایک فرد کو ہے : ﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ﴾ پس اسی کی دعوت دیتے رہو اور اس پر پوری طرح مستقیم رہو' جاگزیں اور قائم رہو اور لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو۔ ﴿ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ' وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ﴾ اور دوٹوک الفاظ میں اعلان کر دو کہ میں تو ایمان رکھتا ہوں اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہارے مابین انصاف کروں۔ اس کے بعد جو بھی مخالفین اور معاندین اس دعوت کا راستہ روکنے کے لئے آگے بڑھیں' ان کے بارے میں نہایت بلیغ انداز اور بڑے دلنشیں پیرائے میں دوٹوک الفاظ میں فرمایا : ﴿ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ' لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ' لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ' اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ○ ﴾ (آیت ۱۵) یہ جھگڑا کاہے کے لئے ہے؟ یہ فساد آخر کس بات پر ہے؟ اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے' ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں' ہم اگر کوئی خیر کمار ہے ہیں تو اس کا فائدہ ہم ہی کو پہنچے گا اور اگر بالفرض شر بھی کمار ہے ہیں تو اس کا وبال تم پر نہیں بلکہ ہم پر ہی آئے گا۔ ہمارے اور تمہارے مابین اس تکرار کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک وقت آنے والا ہے جب ہم اللہ کے حضور میں جمع ہو جائیں گے' تب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا' معلوم ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ آیات امت مسلمہ کے ان افراد کیلئے بالخصوص بڑی رہنمائی کی حامل ہیں جن کو اللہ تعالیٰ یہ توفیق عطا فرمائے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اللہ کے دین

یعنی اسلام کو دنیا میں قائم کرنے کیلئے سعی کریں اور اس کیلئے "دعوت الی الکتاب" یعنی کتاب ہی کی طرف بلانے کو ذریعہ اور منہاج اختیار کریں۔

اس سورۂ مبارکہ میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے ضمن میں ایک انتہائی اہم ہدایت وارد ہوئی' فرمایا : ﴿ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ (آیت ۳۸) ان کے معاملات آپس میں باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔ آخر میں نبی کریم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے نبی (ﷺ) ہم نے اس قرآن کو آپؐ کیلئے بھی نور بنایا ہے۔ آپؐ کو اس (قرآن) کے وحی کئے جانے سے قبل کچھ معلوم نہ تھا : ﴿ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ﴾ آپؐ کچھ نہ جانتے تھے کہ ایمان کسے کہتے ہیں اور کتاب و شریعت کس چیز کا نام ہے؟ ہم نے اس قرآن کو آپؐ کے حق میں نور بنایا ہے اور اس قرآن کے حامل اور مہبط ہونے کی بنا پر اب سیدھی راہ کی طرف ہدایت دینے والے بھی آپؐ ہی ہیں : ﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ﴾ (آیت ۵۲)

سورۃ الزخرف اور سورۃ الدخان میں یہ مضمون مشترک ہے کہ دونوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ سورۃ الزخرف میں حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اجمالی ذکر ہے۔ اور کفار کا ایک عجیب قول بھی سورۃ الزخرف ہی میں نقل ہوا ہے' انہوں نے کہا کہ اللہ کو اگر یہ قرآن نازل کرنا ہی تھا تو یہ جو دو بڑے بڑے شہر مکہ اور طائف ہیں' ان میں بڑے بڑے سردار اور صاحب ثروت لوگ موجود تھے' اللہ اگر نازل کرتا تو ان پر نازل کرتا : ﴿ لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ ﴾ (آیت ۳۱) یہ بنی ہاشم کا ایک یتیم اللہ کو کیسے پسند آ گیا؟ جواباً ارشاد فرمایا گیا : ﴿ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ﴾ (آیت ۳۲) کیا یہ تیرے رب کی رحمت کو تقسیم کرنے کے ٹھیکیدار بن گئے ہیں؟ اللہ کو خوب معلوم ہے کہ نبوت اور رسالت کے لئے جو اوصاف مطلوب ہیں وہ کس میں موجود ہیں : ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ (الانعام : ۱۲۵) اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت

کے فرائض ادا کرنے کے لئے جس قسم کے سیرت و کردار کی ضرورت ہے' جن اوصاف جلیلہ کا حامل ہونا ضروری ہے وہ کس میں ہیں اور کس میں نہیں ہیں!

سورۃ الدخان کا آغاز ہوا اس لیلۂ مبارکہ کے ذکر سے جس میں قرآن مجید کا نزول ہوا : ﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ (آیت ۳) یہ وہی شب ہے جو آخری پارے میں لیلۃ القدر کے نام سے موسوم ہوئی ہے' جو رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ہے اور جس کے بارے میں آخری پارے میں فرمایا گیا کہ تم کیا سمجھتے ہو اس کی قدر و قیمت کو؟ ﴿ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ ﴾ (القدر : ۳) وہ ہزار مہینوں سے بھی افضل ہے۔

سورۃ الجاثیہ میں دوسرے اہم مضامین کے ساتھ ساتھ ایک بڑا اہم مضمون یہ وارد ہوا ہے کہ جس طرز فکر کو ہم مادہ پرستانہ الحاد کہتے ہیں وہ کوئی جدید دور کی پیداوار نہیں ہے' بلکہ یہ فکر ہمیشہ سے موجود ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے صرف حواس خمسہ پر انحصار کیا اور اس سے ماوراء کسی ہدایت سے منہ موڑا' ان کا نقطۂ نظر ہمیشہ یہی رہا ہے جو آج کے مادیین اور ملحدین کا ہے۔ ان کا قول نقل ہوا : ﴿ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ﴾ (آیت ۲۴) ہم کسی اور زندگی کو نہیں مانتے' زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے' اس کے سوا کوئی زندگی نہیں' ہم خود ہی جیتے ہیں اور خود ہی مرتے ہیں اور ہمیں مارنے والی کوئی اور شے' کوئی اور طاقت' کوئی اور بڑی قوت' کوئی حاکم اور کوئی مالک نہیں ہے' سوائے گردش فلک کے۔ یہ زمانہ جو چل رہا ہے' یہ افلاک جو گردش میں ہیں' انہی کی گردش سے یہ سارا نظام آپ ہی آپ رواں ہے۔ یوں سمجھئے کہ درحقیقت ایک فقرے میں گویا کوزے میں دریا بند کر دیا گیا ہے۔ دورِ جدید کا مادہ پرستانہ الحاد جس کی زبردست چھاپ آج کے انسان کے ذہن پر پڑ چکی ہے' وہ حقیقتاً یہی ہے۔ ایک اور اہم قول بھی نقل ہوا' کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو حیات اُخروی کو کسی درجے میں ماننے کا اظہار کرتے ہیں لیکن وہ قیامت کے بارے میں کہتے ہیں : ﴿ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا

وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ○﴾ (آیت ۳۲) ہمیں کچھ گمان سا تو ہوتا ہے کہ شاید نبیوں نے جو خبر دی ہے وہ درست ہو' لیکن اس پر یقین نہیں بیٹھتا' دل نہیں ٹھکتا۔ ہم اگر اپنے گریبانوں میں منہ ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ ہم میں سے اکثر کی حالت یہی ہے' ہم آخرت اور معاد کے ماننے والے تو ہیں لیکن اس پر جو یقین ضروری ہے جس کے بغیر سیرت و کردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی اور انسانی اعمال پر کوئی اثرات مترتب نہیں ہو سکتے' اِلا ماشاء اللہ' ہمارے قلوب اس سے خالی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دولت ایمان سے سرفراز فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ○

وقت کے نہایت اہم' انتہائی نازک اور حساس موضوع پر

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی وقیع تالیف

شیعہ سنی مفاہمت

کی ضرورت و اہمیت

شائع ہو گئی ہے۔ جس میں مذکورہ بالا موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب کے فکر انگیز خطاب کے ساتھ ساتھ درج ذیل موضوعات پر مضامین بھی شامل ہیں :

i) حضرت مہدی موعود کی شخصیت کے بارے میں اہل سنت و اہل تشیع کا موقف (از : ڈاکٹر اسرار احمد)

ii) امیر تنظیم اسلامی کے سفر ایران کے مشاہدات و تاثرات

iii) اسلام میں مختلف مسالک کی حیثیت اور مفاہمت کا راستہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

درس ۱۲

عائلی زندگی کے بنیادی اصول

سورۃ التحریم کی روشنی میں

—— (۲) ——

تربیت اولاد اور والدین کی ذمہ داریاں

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا وَّقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ عَلَیْھَا مَلٰٓئِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ○ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْیَوْمَ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ○ ﴾ (آیات ۶'۷)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے' جس پر نہایت تُند خُو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔ (اُس وقت کہا جائے گا کہ) اے کافرو! آج معذرتیں پیش نہ کرو' تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جو عمل تم کیا کرتے تھے"۔

سورۃ التحریم کی چھٹی آیت میں ایک مسلمان خاندان کے سربراہ کی ذمہ داری مثبت انداز میں امر کے صیغے میں بیان کی جا رہی ہے۔ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں یہ مضمون دو مواقع پر پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔ سورۃ التغابن میں اہل ایمان کو خبردار کیا گیا : ﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ ﴾ "اے

اہل ایمان! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولادوں میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' پس ان سے ہوشیار رہو" ـــــ اگرچہ ہماری اجتماعی زندگی کا جو نقشہ ہے اس کی بنیاد میں مال و اولاد کی طبعی محبت ہی کار فرما ہے۔ یہ محبت اپنی جگہ صحیح اور درست ہے' لیکن بسا اوقات یہ طبعی و فطری محبت حد اعتدال سے تجاوز کر کے اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ انسان اپنے اہل و عیال کی محبت کی وجہ سے اللہ کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر بیٹھتا ہے۔ بیویوں کی فرمائشیں پوری کرنے' اولاد کو اچھے سے اچھا کھلانے پلانے اور ان کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے انسان حرام میں منہ مارنے لگتا ہے۔ گویا یہ محبت نتیجہ کے اعتبار سے اس کے لئے محبت نہیں بلکہ عداوت بن جاتی ہے اور اس کی عاقبت کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتی ہے ـــــ اس آیت میں اسی حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں اسی فطری محبت کا ذکر ایک مثبت انداز سے ہوا ہے۔ ایک بندۂ مومن کے دل میں یہ فطری تمنا ہوتی ہے کہ اس کے اہل و عیال بھی ایمان' اسلام' تقویٰ اور احسان کی روش اختیار کریں۔ یہ تمنا اور آرزو اس قرآنی دعا کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے :

﴿ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ ﴾ (الفرقان : ۷۴)

"جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب' ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا"۔

یہی مضمون سورۃ التحریم کی زیر نظر آیت میں اپنی منطقی انتہا کو پہنچ رہا ہے۔ یعنی ایک مسلمان کی ذمہ داری صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے نان نفقہ کا اہتمام کرے' انہیں کھلائے پلائے' ان کے رہن سہن کی ضرورتیں پوری کرے۔ یہ تو جبلی طور پر ہر انسان کرتا ہے۔ ایک خاندان کے سربراہ کے مومن و مسلم ہونے کا نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ اللہ نے اپنی مخلوق میں سے جن کو بطورِ امانت اس کے حوالے کیا ہے وہ ان کے صحیح حقوق کی ادائیگی کی فکر کرے ـــــ اس امانت کا حق اس طرح ادا ہو گا کہ ان کی بہتر سے بہتر دینی تربیت کی کوشش کرے تاکہ وہ صحیح رُخ پر پروان چڑھیں۔ لیکن اگر اسے

اس ذمہ داری کا احساس نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ ایک مسلمان خاندان کا سربراہ اپنی ذمہ داری کو بحیثیت ایک مسلمان ادا نہیں کر رہا۔

اس طرف متوجہ کرنے کیلئے قرآن مجید کا انداز بڑا فطری ہے۔ تنبیہ کا آغاز ﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ﴾ "اے اہل ایمان بچاؤ اپنے آپ کو" کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں قیامت کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے کہ اُس روز ہر ایک کو اپنی فکر پڑی ہو گی۔ اُس وقت ہر شخص بھول جائے گا کہ کون میرا بیٹا ہے' کون میری بیوی ہے اور کون میرا باپ ہے! سورۂ عبس میں آتا ہے ﴿فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ○ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ○ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ○ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ○﴾ "آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز ہو گی ـــــ اُس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا"۔ اور سورۃ المعارج میں فرمایا گیا کہ

﴿وَلَا یَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا○ یُّبَصَّرُوْنَهُمْ' یَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ یَفْتَدِیْ مِنْ عَذَابِ یَوْمِئِذٍ بِبَنِیْهِ○ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِیْهِ○ وَفَصِیْلَتِهِ الَّتِیْ تُئْوِیْهِ○ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ یُنْجِیْهِ○﴾ (المعارج : ۱۰-۱۴)

"اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لئے اپنی اولاد کو' اپنی بیوی کو' اپنے بھائی کو اور اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے"۔

اسی لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ "بچاؤ اپنے آپ کو"۔ اور اس کے بعد اپنے قریب ترین افراد یعنی اہل خانہ' جن سے انسان کو بہت محبت ہوتی ہے' کو اس آگ سے بچانے کی ہدایت کی جا رہی ہے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔

اس سورۂ مبارکہ کے خاص اسلوب سے اس آیت کا جو ربط و تعلق ہے اسے اس مقام پر نوٹ کر لیجئے۔ ہر سورۂ مبارکہ کا ایک عمود یعنی ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے جس کے ساتھ سورت کی ہر آیت منسلک اور مربوط ہوتی ہے۔ یہاں بھی دیکھئے کہ اولاد کی

تربیت میں بسا اوقات لاڈ پیار حائل ہو جاتا ہے جو اولاد کے بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے ـــــ آپ بچے کی صبح کی میٹھی نیند میں خلل ڈالنا نہیں چاہتے' اس لئے اسے فجر کی نماز وقت پر ادا کرنے کا عادی نہیں بنا رہے۔ آپ کا دل چاہتا ہے کہ وہ سوتا رہے۔ اب اگر آپ کی اس بے جا شفقت و محبت کے نتیجے میں وہ بچہ بعد میں نماز کا پابند نہ ہو سکا تو آپ خود سوچئے کہ آپ نے اس کے حق میں کتنے کانٹے بو دیئے ہیں۔ اس کی تربیت اس طرح کس تباہی کے رخ پر ہو رہی ہے اور اس کی زندگی عاقبت کے اعتبار سے کس خسارے کی راہ پر گامزن ہو رہی ہے۔ اسی طرح اگر اپنی بیویوں کے ساتھ لاڈ پیار اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اللہ کے احکام میں خلل پیدا ہو رہا ہے' حدود اللہ ٹوٹ رہی ہیں' اللہ کا تقویٰ نگاہوں سے اوجھل ہو رہا ہے اور اس سے دل غافل ہو رہا ہے تو اچھی طرح جان لیجئے کہ آپ کی طرف سے آپ کی یہ محبت نہ آپ کے حق میں نافع ہے اور نہ ان کے حق میں' بلکہ یہ دونوں کے لئے عداوت ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے نبی اکرم ﷺ نے ایک نہایت جامع قاعدہ کلیہ ارشاد فرمایا ہے ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ)) "تم میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے ریوڑ کے بارے میں جواب دہ ہے"۔ جس طرح ایک چرواہا اور گلہ بان ان مویشیوں کی حفاظت کا ذمہ دار اور مسئول ہوتا ہے جو اس کے چارج میں دیئے گئے ہیں اور اس میں سے اگر کوئی جانور گم ہو جائے یا حادثہ کا شکار ہو جائے تو اس چرواہے کا محاسبہ ہوتا ہے کہ اس جانور کی گم شدگی میں اس کی غفلت کا کتنا دخل ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہر انسان کے حوالے اپنی مخلوق میں سے کچھ افراد کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی کسی دفتر میں افسر ہے تو جو اس کے ماتحت ہیں' وہ گویا ایک گلہ ہے جس کا وہ نگہبان ہے۔ اس کو اپنی حیثیت کے تناسب سے اپنے ماتحتوں کے دین و ایمان اور ان کی سیرت و کردار کے بارے میں فکر مند رہنا چاہئے کہ یہ چیزیں صحیح رُخ پر رہیں' کیونکہ وہ ذمہ دار اور مسئول ہے ـــــ اور خاندان کے سربراہ پر تو یہ اصول صد فیصد راست آتا ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے لئے ذمہ دار اور مسئول ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اپنے گھرانے کی قریب ترین خواتین کو لے کر بیٹھتے تھے اور ایک ایک کا نام لے کر انہیں نصیحت فرماتے تھے۔ مثلاً اپنی لخت جگر نورِ نظر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا :

"اے فاطمہ! محمد (ﷺ) کی لخت جگر! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس لئے کہ اللہ کے ہاں تمہارے باب میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے"۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا :

"اے صفیہ 'اللہ کے رسول کی پھوپھی! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو' اس لئے کہ اللہ کے ہاں تمہارے بارے میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے"۔

تو یہ ہے حضور ﷺ کا متوجہ کرنے 'خبردار کرنے اور ترغیب و ترہیب کا انداز۔ ہر مسلمان گھرانے کے سربراہ کا یہ وہ مثبت رول ہے جسے اپنے اہل و عیال کے ضمن میں ادا کرنے کے لئے اسے فکر مند رہنا چاہئے۔

اب دیکھئے کہ یہ بڑا لطیف اور بلیغ انداز اختیار فرمایا گیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو اس آگ سے بچانے کی فکر کرو جس کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ پتھروں کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ انسان جب جہنم میں جھونکے جائیں گے تو گویا وہ اس کا ایندھن ہوں گے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ پتھروں کے ذکر میں کیا حکمت ہے! غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذکر اس اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے کہ اس آگ کی شدت و حرارت کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ایک آگ تو وہ ہے جو لکڑیوں سے جلائی جاتی ہے اور ایک آگ وہ ہے جو پتھروں سے جلے گی۔ پتھر کے کوئلوں سے کسی زمانہ میں جو آگ جلا کرتی تھی اس کی حرارت کا ذرا تصور کیجئے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر سوچئے کہ اصل پتھر جس آگ کا ایندھن بن رہے ہوں' اس کی تُندی و تیزی اور شدت کا کیا عالم ہو گا! ـــــ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ بُت عموماً پتھروں سے تراشے جاتے ہیں اور انہیں معبود سمجھا جاتا ہے' ان پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں' ان کے آگے ماتھا ٹیکا جاتا ہے' ان سے حاجت روائی کے لئے دعائیں

کی جاتی ہیں' اس لئے مشرکوں کے ساتھ پتھروں کے یہ بُت بھی جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے تاکہ ان کی حسرت میں مزید اضافہ ہو کہ جنہیں ہم معبود سمجھے بیٹھے تھے وہ بھی ہمارے ساتھ اس آگ میں جل رہے ہیں۔

آگے فرمایا : "اس جہنم پر وہ فرشتے مامور ہیں جو بڑے سخت دل اور تُند خو ہیں"۔ غور کیجئے' بہت ہی لطیف انذار ہے کہ آج تم بڑی محبت' شفقت اور لاڈ پیار کی وجہ سے اپنی اولاد کو بگاڑ رہے ہو' لیکن نتیجہ کے طور پر وہ ان تُند خو اور سخت گیر فرشتوں کے حوالہ ہوں گے جو جہنم کے کارندے اور داروغے ہیں اور ان کے دلوں میں کوئی نرمی اور محبت نہیں ہے۔ تمہاری یہ چہیتی اولاد کتنی ہی فریاد کرے ان فرشتوں کے دل پسیجیں گے نہیں۔ ان کے دل میں رحم اور رأفت کا جذبہ رکھا ہی نہیں گیا۔ وہ بڑے سخت دل اور تند خو ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ "وہ اللہ کی طرف سے ملنے والے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔ اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ملتا ہے"۔

ان آیات سے فرشتوں پر ایمان کے بارے میں بھی رہنمائی ملتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ فرشتوں پر ایمان ہمارے ایمانیات کا لازمی حصہ ہے۔ دنیا میں دیویوں اور دیوتاؤں کے تصورات درحقیقت "فرشتوں پر ایمان" ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس تصور میں بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ فرشتوں کو بااختیار سمجھ لیا گیا۔ قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ اگرچہ ملائکہ ایک نوری مخلوق ہیں اور ان کا رتبہ بہت بلند ہے لیکن وہ بااختیار مخلوق نہیں۔ اسی بات کو یہاں ان الفاظ مبارکہ سے واضح کیا گیا کہ ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ جب یہ حقیقت سامنے آگئی تو اب ان کو پکارنا بیکار' ان سے دعا کرنا لاحاصل اور ان کو پوجنا بے فائدہ ـــــ لہٰذا اللہ کو پکارو' اللہ سے دعا کرو' اللہ سے مدد مانگو۔ اللہ تعالیٰ جس ذریعے سے چاہے آپ کی ضرورت پوری کردے۔ وہ کسی انسان کے دل میں ڈال دے' کسی فرشتہ کو مامور کردے' یہ اس کا اختیارِ مطلق ہے۔ فرشتے اس اعتبار سے ایک مجبور اور ناچار مخلوق ہیں کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی بڑی خوبصورت وضاحت سورۂ مریم میں آئی ہے۔ متعلقہ آیت کے بین السطور سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت جبریلؑ سے شکوہ کیا کہ اے جبریل! آپ وقفہ وقفہ سے

آتے ہیں' ہمیں انتظار رہتا ہے۔ اس شکوہ کا حضرت جبریلؑ سے اللہ تعالیٰ نے جواب دلوایا کہ ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝﴾ "اے نبی! ہم آپ کے رب کے حکم کے بغیر نہیں اترا کرتے۔ جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے ہر چیز کا مالک وہی ہے' اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے"۔ یعنی نزول وحی میں وقفہ کسی بھول کے باعث نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی حکمت بالغہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اگلی آیت میں نقشہ کھینچا گیا کہ جب لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے تمہارے یہ لاڈلے اور پیارے جہنم میں جھونکے جائیں گے تو اس وقت وہ معذرتیں کریں گے' دہائیاں دیں گے اور چیخ وپکار کریں گے تو ان کو جواب دیا جائے گا ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ﴾ "اے ناشکرو! آج بہانے مت بناؤ' معذرتیں نہ تراشو"۔ اب اس کا کچھ حاصل نہیں۔ ﴿اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ "تمہیں بدلے میں وہی کچھ دیا جارہا ہے جو تم کرتے تھے" یہ تمہارے اپنے اعمال ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دنیا میں ان میں لذت اور سرور تھا۔ وہاں تمہاری بداعمالیاں "SUGAR COATED PILLS" کی حیثیت رکھتی تھیں' جس کے باعث ان کی تلخی تم پر نمایاں نہیں ہوتی تھی اور جس انجام سے تمہیں دوچار ہونا تھا وہ تم پر واضح نہیں ہوتا تھا۔ تم نے اپنے افعال پر اپنی خواہشات نفس کی COATING کر رکھی تھی' اب وہ اُتر گئی ہے' لہٰذا اس کی حقیقی وواقعی تلخی کا مزا ہے جو تم یہاں چکھ رہے ہو۔ یہ تمہارے وہی اعمال ہیں جو آج تمہارے سامنے آگئے ہیں۔ یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی اور تمہارے اپنے کرتوت ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس انجام بد سے ہم سب کو بچائے۔ آمین!

تَوْبَةً نَّصُوْحًا کا ہمارے دین میں مقام

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يَوْمَ

لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْلَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ○ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ○ (آیات ۸'۹)

"اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ۔ امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم سے تمہاری برائیوں کو دُور فرمادے گا اور تمہیں ان باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ اُس دن اللہ ہرگز رُسوا نہ کرے گا' نہ اپنے نبی کو اور نہ ان کے ساتھی اہل ایمان کو۔ ان کا نور دوڑتا ہوا ہو گا ان کے سامنے بھی اور ان کے داہنی جانب بھی ـــــ اور وہ یہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے لئے ہمارے اس نور کو پورا فرمادے اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما' یقیناً تجھے ہر شے پر قدرت اور ہر کام پر اختیار حاصل ہے۔ اے نبی (ﷺ) کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے"۔

ان میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ تمام اہل ایمان کو توبہ کا حکم دے رہے ہیں' یا یوں کہہ لیجئے کہ توبہ کی ترغیب دے رہے ہیں۔ لیکن توبہ وہ ہو جو خالص توبہ ہو' جو خلوص دل سے کی گئی ہو' جو صحیح معنی میں توبہ ہو۔ ہمارے اس سلسلۂ درس میں سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کے ضمن میں توبہ کے موضوع پر بڑی مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔ توبہ کا فلسفہ' توبہ کی عظمت' ہمارے دین کی حکمت میں اس کا مقام اور توبہ کے صحیح ہونے کے لئے شرائط جیسے تمام امور زیر بحث آچکے ہیں۔

موقع کی مناسبت سے میں یہاں ایک حدیث کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حدیث حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس کی ایک تو متفق علیہ روایت ہے یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے جبکہ ایک ذرا تفصیلی روایت صرف مسلم شریف میں ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ نے اس بات کو واضح فرمانے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے کسی بندے کی توبہ سے کتنی خوشی ہوتی ہے' ایک تشبیہ بیان کی ہے۔ آپؐ نے

فرمایا کہ ایک ایسے شخص کا تصور کرو جو کسی لق و دق صحرا میں تنہا سفر کر رہا ہے' اس کے پاس ایک اونٹنی ہے' اسی پر اس کا زادِ راہ یعنی راشن اور پانی وغیرہ ہے۔ وہ تھوڑی دیر ستانے کے لئے کسی درخت کے سایہ تلے بیٹھتا ہے' اونٹنی بھی پاس ہی کھڑی ہے۔ وہاں پر اس کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ اسی اثناء میں اس کی اونٹنی غائب ہو جاتی ہے۔ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ دیوانہ وار اونٹنی کی تلاش میں کبھی اِدھر دوڑتا ہے' کبھی اُدھر بھاگتا ہے۔ اس کے اضطراب اور بیتابی کا آپ خود تصور کر سکتے ہیں' اس لئے کہ وہ اونٹنی ہی درحقیقت اس کے لئے وسیلۂ حیات اور ذریعۂ زندگی ہے۔ وہی اس کی سواری ہے' اسی پر اس کا کھانا اور پانی ہے۔ وہ ہر چہار طرف بھاگ دوڑ کرنے کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ موت کے انتظار میں آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اچانک وہ آنکھیں کھولتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اونٹنی اس کے سامنے کھڑی ہے۔ اس پر وہ اپنی خوشی کی شدت کے باعث ایسا بوکھلا اٹھتا ہے کہ کہنا تو یہ چاہتا ہے کہ "اے اللہ! تو میرا رب ہے' میں تیرا بندہ ہوں" لیکن فرط جذبات سے اس کی زبان لڑکھڑاتی ہے اور اس سے الفاظ نکلتے ہیں "اے پروردگار! میں تیرا رب ہوں' تو میرا بندہ ہے"۔ تصور کیجئے کہ اونٹنی دوبارہ پا لینے پر اس شخص کی فرط مسرت کا کیا عالم ہے! نبی اکرم ﷺ یہ تشبیہ بیان کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ "اللہ کو اس سے بھی زیادہ خوشی اپنے کسی گنہگار بندے کی توبہ سے ہوتی ہے"۔ احادیث میں توبہ کی جو عظمت بیان ہوئی ہے اور جس قدر شد و مد کے ساتھ اس کی ترغیب دی گئی ہے اسے سامنے رکھئے اور پھر اس آیت کا مطالعہ کیجئے کہ تمام مسلمانوں سے' خواہ وہ کسی زمان و مکان سے تعلق رکھتے ہوں' خطاب فرمایا جا رہا ہے ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾ "اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ"۔

توبہ کے ضمن میں دو مزید احادیث بھی پیش نظر رہنی چاہئیں' جن میں نبی اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں خود روزانہ ستر ستر اور سو سو بار اللہ کی جناب میں توبہ اور استغفار کرتا ہوں۔ ایک روایت صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' اس کے الفاظ ہیں ((وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ فِی الْیَوْمِ اَكْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً)) "اللہ کی قسم! میں روزانہ ستر مرتبہ سے زیادہ اللہ کی جناب میں استغفار بھی کرتا ہوں' توبہ

بھی کرتا ہوں"۔ دوسری روایت صحیح مسلم میں ہے جس کی رو سے نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں ((تُوبُوْا اِلٰی رَبِّکُمْ فَوَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَتُوْبُ اِلٰی رَبِّیْ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی مِائَۃَ مَرَّۃٍ فِی الْیَوْمِ)) "اے لوگو! اپنے پروردگار کی جناب میں توبہ کرو' اس لئے کہ میں خود اپنے پروردگار کے حضور روزانہ سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں" ـــــ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی توبہ کے کیا معنی ہیں؟ حضورؐ سے کسی گناہ کے ارتکاب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا اچھی طرح جان لیجئے کہ نبی اکرم ﷺ کی توبہ اور آپ کے استغفار کا معنی و مفہوم کیا ہے! ـــــ دراصل توبہ کے معنی ہیں رجوع کرنا' پلٹنا' لوٹنا۔ اس کے کم سے کم چار درجے اگر ذہن میں رکھے جائیں تو بات واضح ہو جائے گی۔ ایک شخص وہ ہے جو کفر سے توبہ کرتا ہے اور اسلام میں آتا ہے۔ ایمان لانا بھی ایک نوع کی توبہ ہے۔ جیسے ہم سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں پڑھ آئے ہیں ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا﴾ دوسری توبہ کسی مسلمان شخص کی ہے جو معصیت سے توبہ کرتا ہے' گناہ کو چھوڑ رہا ہے۔ گناہ سے رجوع کر رہا ہے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اطاعت کی طرف۔ تیسری توبہ ہو گی اَبرار یعنی نیکو کاروں کی۔ کسی وقت ایک صالح اور نیک شخص کی قلبی کیفیت ایسی ہو سکتی ہے کہ معرفت الٰہی کے معاملے میں اس کے دل پر کچھ دیر کے لئے غفلت کا پردہ سا پڑ جائے۔ وہ محض غفلت ہے' اس سے کسی معصیت کا ارتکاب نہیں ہوا۔ اسے محض یہ احساس ہوا کہ میرے قلب پر کچھ دیر کے لئے غفلت کا حجاب طاری رہا ہے۔ اب وہ غفلت سے استحضار اللہ فی القلب کی جانب رجوع کر رہا ہے' دل میں اللہ کی یاد کو مستحضر کرنے کے لئے اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو رہا ہے' یہ بھی توبہ ہے ـــــ پھر ایک توبہ مقربین بارگاہ الٰہی کی ہے۔ یعنی ان کے قلب کا جو مضبوط تعلق اور رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ استوار رہتا ہے' اس کی شدت میں اگر کبھی کوئی کمی محسوس ہوتی ہے تو اس حساسیت کے باعث وہ اس سے بھی توبہ کرتے ہیں اور اپنے تعلق مع اللہ کی اسی سابقہ شدت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ کیفیت جس کو مقربین یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی توبہ میں شمار کیا جا سکتا ہے کہ جب ان نفوس قدسیہ کو یہ محسوس ہو کہ کسی مصروفیت کے باعث ان کے تعلق مع اللہ کی شدت میں ذرا سی بھی کمی ہو گئی ہے تو وہ

اس سے بھی توبہ کرتے اور رجوع فرماتے ہیں۔

اس تناظر میں آپ سمجھئے کہ کوئی صاحب ایمان ایسا نہیں ہے جو اس حکم یا اس ترغیب کا مخاطب نہ ہو کہ ﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا﴾ "اے ایمان والو! اللہ کی جناب میں توبہ کرو خالص توبہ"۔ خالص توبہ کونسی ہو گی؟ اس کے متعلق عرض کی کیا جا چکا ہے کہ کم از کم تین شرطیں پوری ہوں تو وہ خالص توبہ ہو گی۔ اگر حقوق اللہ کے ضمن میں کوتاہی ہوئی ہے تو شدید پشیمانی ہو، مصمم ارادہ ہو کہ میں آئندہ اس کا ارتکاب نہیں کروں گا اور انسان اس گناہ کے کام کو فی الواقع چھوڑ دے۔ اور اگر حقوق العباد کا معاملہ ہے تو مزید ایک شرط یہ ہو گی کہ یا تو اس شخص سے جس کی حق تلفی کی ہے معافی حاصل کرے یا اپنے کسی عمل سے اس کے نقصان کی تلافی کرے۔

اس خالص توبہ کا مقام اور مرتبہ کیا ہے! اسے اسی آیت میں آگے بیان فرمایا: ﴿عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ﴾ عربی زبان میں عَسٰی اور لَعَلَّ کے الفاظ عام طور پر تو "شاید" کے معنی میں آتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید میں جب یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو کر وارد ہوتے ہیں تو شاہانہ اندازِ کلام کی رو سے اس کے معنی ہوتے ہیں "تاکہ" اور "امید ہے کہ" یعنی اس میں بشارت کا پہلو ہوتا ہے۔ لہٰذا ترجمہ یہ ہو گا کہ "امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری برائیوں کو دور فرما دے گا" ﴿وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ﴾ "اور تمہیں ان باغات میں داخل فرمائے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی"۔

آگے فرمایا کہ اُس دن یعنی قیامت کے روز سب کے لئے رسوائی ہو گی، صرف انبیاء کرام علیہم السلام، ان کے پیروکار اور سب سے بڑھ کر النبی الخاتم جناب حضرت محمد ﷺ اور ان کے ساتھی اہل ایمان اس رسوائی سے بچے ہوئے ہوں گے: ﴿یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ﴾ آگے فرمایا: ﴿نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ﴾ "ان کا نور ان کے سامنے اور ان کی داہنی طرف دوڑتا ہو گا" ـــــ یہ بات جان لیجئے کہ انسان کے ایمان کا محل و مقام اس کا قلب ہے۔ ایمان حقیقت میں ایک روشنی ہے، ایک نور ہے۔ یہ بات ہم سورۃ النور کی آیتِ نور کے حوالے سے پہلے اچھی طرح سمجھ بھی چکے

اس سے بھی توبہ کرتے اور رجوع فرماتے ہیں۔

اس تناظر میں آپ سمجھئے کہ کوئی صاحب ایمان ایسا نہیں ہے جو اس حکم یا اس ترغیب کا مخاطب نہ ہو کہ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا﴾ "اے ایمان والو! اللہ کی جناب میں توبہ کرو خالص توبہ"۔ خالص توبہ کونسی ہوگی؟ اس کے متعلق عرض کی جا چکا ہے کہ کم از کم تین شرطیں پوری ہوں تو وہ خالص توبہ ہوگی۔ اگر حقوق اللہ کے ضمن میں کوتاہی ہوئی ہے تو شدید پشیمانی ہو، مصمم ارادہ ہو کہ میں آئندہ اس کا ارتکاب نہیں کروں گا اور انسان اس گناہ کے کام کو فی الواقع چھوڑ دے۔ اور اگر حقوق العباد کا معاملہ ہے تو مزید ایک شرط یہ ہوگی کہ یا تو اس شخص سے جس کی حق تلفی کی ہے معافی حاصل کرے یا اپنے کسی عمل سے اس کے نقصان کی تلافی کرے۔

اس خالص توبہ کا مقام اور مرتبہ کیا ہے! اسے اسی آیت میں آگے بیان فرمایا: ﴿عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ﴾ عربی زبان میں عَسٰی اور لَعَلَّ کے الفاظ عام طور پر تو "شاید" کے معنی میں آتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید میں جب یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو کر وارد ہوتے ہیں تو شاہانہ اندازِ کلام کی رُو سے اس کے معنی ہوتے ہیں "تاکہ" اور "امید ہے کہ" یعنی اس میں بشارت کا پہلو ہوتا ہے۔ لہٰذا ترجمہ یہ ہوگا کہ "امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری برائیوں کو دور فرمادے گا" ﴿وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ﴾ "اور تمہیں ان باغات میں داخل فرمائے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی"۔

آگے فرمایا کہ اُس دن یعنی قیامت کے روز سب کے لئے رسوائی ہوگی، صرف انبیاء کرام علیہم السلام، ان کے پیروکار اور سب سے بڑھ کر النبی الخاتم جناب حضرت محمد ﷺ اور ان کے ساتھی اہل ایمان اس رسوائی سے بچے ہوئے ہوں گے: ﴿یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ﴾ آگے فرمایا: ﴿نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ﴾ "ان کا نور ان کے سامنے اور ان کی داہنی طرف دوڑتا ہوگا" ـــــ یہ بات جان لیجئے کہ انسان کے ایمان کا محل و مقام اس کا قلب ہے۔ ایمان حقیقت میں ایک روشنی ہے، ایک نور ہے۔ یہ بات ہم سورۃ النور کی آیتِ نور کے حوالے سے پہلے اچھی طرح سمجھ بھی چکے

ہیں۔ اس قلب میں جو نورِ ایمان ہے' وہ میدانِ حشر میں ظاہر ہو جائے گا اور اس کی روشنی انسان کے سامنے پڑے گی ـــــ اسی طرح انسان کے نیک اعمال میں بھی ایک نورانیت ہے۔ البتہ اس دنیا میں ان کا ظہور نہیں ہوتا' میدانِ حشر میں ان کا ظہور ہو گا۔ نیک کاموں کا کمانے والا عام طور پر انسان کا داہنا ہاتھ ہوتا ہے' لہٰذا میدانِ حشر میں انسان کے نیک اعمال کا نور اس کے داہنی جانب نمایاں ہو گا ﴿ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ﴾ "دوڑتا ہو گا ان کا نور ان کے آگے اور ان کی داہنی طرف" ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ﴾ "اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! (اگر ہمارے نور میں کچھ کمی رہ گئی ہے تو) ہمارے لئے ہمارے نور کو پورا کر دے اور ہم کو معاف کر دے"۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میدان حشر میں یہ نور ہر شخص کو اس کے مقام اور مرتبہ کے اعتبار سے ملے گا۔ ایمان کے بھی مدارج و مراتب ہیں۔ ایک ایمان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے اور ایک ہاشمی کا ایمان ہے۔ ان کے مابین ظاہر ہے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر ہمیں ایمان کی ذرا سی رمق بھی میسر ہو تو وہ بھی ہمارے لئے بہت بڑی کامیابی ہے۔ کہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نورِ ایمان ! اور کہاں ہمارا ایمان ـــــ ! حضور ﷺ نے فرمایا کہ اُس روز میدانِ حشر میں لوگوں کو جو نور ملے گا تو کسی کا نور اتنا ہو گا کہ جیسے وہ مدینہ میں ہو اور اس کی روشنی صنعاء (یمن کے دارالحکومت) تک پہنچ جائے اور کسی کا نور بس اس قدر ہو گا کہ اس کے قدموں کے سامنے روشنی ہو جائے۔ جن کو اُس روز اتنا نور مل جائے وہ بھی بڑے نصیب والے اور کامیاب و کامران لوگ شمار ہوں گے کیونکہ وہ اس کٹھن اور سخت مرحلہ سے گزر جائیں گے جس سے آگے ان کی منزل مراد یعنی جنت ہے۔ کم نور والوں کے نور کی حیثیت گویا اس ٹارچ کی روشنی کی سی ہو گی جس کو لے کر انسان کسی پگڈنڈی پر چل تو لیتا ہے۔ پس اس کٹھن مرحلہ کے لئے فرمایا کہ وہ لوگ دعا کر رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارے نور میں ہماری کوتاہیوں کے باعث کمی رہ گئی ہے' پس تُو ہمارے اس نور کا اِتمام فرما دے اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما' ہمیں بخش دے۔ یہ ہمارے گناہ ہیں جن کی وجہ سے ہماری نورانیت میں کمی رہ گئی ہے' تو اپنے خاص خزانۂ فضل سے اپنے خصوصی اختیار سے اس کمی اور تقصیر کی

تلافی فرما دے' اس لئے کہ ﴿ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴾ "یقیناً تجھے ہر شے کا اختیار حاصل ہے"۔

اس کے بعد اگلی آیت میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب ہے اور بظاہر یہ آیت اس سورت کے مضامین سے غیر متعلق سی معلوم ہوتی ہے۔ ابھی تک ساری باتیں حضور ﷺ کے گھر والوں سے متعلق' اہل ایمان سے متعلق اور مسلمانوں کے عائلی نظام سے متعلق تھیں' لیکن یہاں یہ بات فرمائی گئی کہ ﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ ﴾ "اے نبی! (ﷺ) آپؐ کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے" وہ آپؐ کی نرمی' آپؐ کی مروت' آپؐ کی شفقت اور آپؐ کی رحمت عمومی سے فائدہ اٹھانے نہ پائیں۔ وہ تو غلظت اور سختی کے مستوجب ہو چکے ہیں۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

یہ آیت بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ سورۃ التوبہ میں بھی وارد ہوئی ہے۔ سورۃ التوبہ کی یہ ۷۳ ویں آیت ہے۔ سورۃ التحریم کے مضامین سے اس آیت کا بڑا لطیف ربط ہے۔ دراصل اس سورۂ مبارکہ کا مرکزی مضمون (Axis) یہ ہے کہ نرمی' شفقت' دلجوئی' کسی کے جذبات کا لحاظ اور پاس کرنا یہ فی نفسہٖ تو بہت اچھی ہیں' بہت مطلوب اور پسندیدہ ہیں' لیکن اگر ان میں حد اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو یہ چیز مختلف پہلوؤں سے خرابیاں پیدا ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔ اولاد کے ساتھ بے جا لاڈ پیار اور بے جا نرمی کا معاملہ ہو تو اس کے بے راہ اور آوارہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ وہاں بھی نرمی مطلوب تو ہے لیکن ایک حد تک۔ اسی طرح جب انسان اپنے نفس کے معاملہ میں نرمی کرتا ہے تو خرابی کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ چونکہ ہمارا دین' دینِ فطرت ہے' لہٰذا اس میں ہمارے اوپر اپنے نفس کے حقوق بھی معین کئے گئے ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے ((وَاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَیْكَ حَقًّا)) "اور بے شک تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے"۔ اس پر بے جا سختی پسندیدہ نہیں ہے۔ ہمارے دین میں رہبانیت جائز نہیں ہے ((لَا رَهْبَانِیَّةَ فِی الْاِسْلَامِ))' ہمارے دین میں نفس کشی کی اجازت نہیں ہے' بلکہ ضبط نفس کی ہدایت ہے کہ اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھو۔ لیکن نفس کو بالکل کچل ڈالنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس

کے تقاضوں کو صحت مند اور جائز و حلال ذرائع سے پورا کرنے کی اجازت ہے۔ اس نفس کے جو تقاضے ہیں وہ تمدن کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے ضروری ہیں۔ لہٰذا اس پر بھی نرمی کرو، لیکن اگر یہ نرمی کہیں حد اعتدال سے تجاوز کر جائے گی تو معصیت کی طرف لے جائے گی۔ لہٰذا اس کی باگیں تھام کر اور کھینچ کر رکھو ـــــ اسی طرح کا معاملہ کفار اور منافقین کا ہے۔ ان کے بارے میں کوئی نرمی تمہارے دل میں نہ ہو۔ اہل ایمان کی جو شان قرآن مجید میں ایک سے زائد مقام پر آئی ہے وہ ﴿ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ کی شان ہے۔ یعنی وہ کفار کے حق میں نہایت سخت ہوتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے لئے نہایت رحیم و شفیق ہوتے ہیں۔ کفار کے لئے سختی کی ضرورت اس لئے ہے کہ وہ کہیں مسلمانوں کے جسد ملی میں انگلی نہ دھنسا سکیں۔ وہ مسلمانوں کو نرم چارا نہ سمجھ بیٹھیں۔ اس تناظر میں نبی اکرم ﷺ کا معاملہ دیکھئے کہ آپؐ سراپا رحمت و شفقت ہیں۔ آپؐ کی یہ شان خود اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ آپؐ رؤف و رحیم ہیں، آپؐ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ہیں۔ آپؐ میں نرمی، رقت قلب اور خلق خدا کے حق میں رأفت و رحمت کا معاملہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ لہٰذا بسا اوقات اس سے کفار و مشرکین اور منافقین ناجائز فائدہ اٹھا جاتے تھے۔ چنانچہ آپؐ سے فرمایا گیا : ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾

معلوم ہوا کہ اس سورۂ مبارکہ کا جو مرکزی خیال ہے اس کے ساتھ یہ آیت بھی مربوط ہے، اگرچہ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس سورت کے سیاق و سباق سے اس کا کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝۝

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

کتابتِ مصاحف اور علمِ ضبط

علاماتِ ضبط کی ابتداء، ان کے متنوع ارتقاء اور ان کے زمانی اور مکانی ممیّزات کا اجمالی جائزہ

——— پروفیسر حافظ احمد یارؒ ———

۱۔ قرآن کریم کی درست قراءت کے لئے اس کی درست کتابت ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اسی بناء پر اور صحت قراءت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے، کتابت مصاحف میں چند ایک امور کا التزام کیا جاتا ہے۔ مثلاً قواعد رسم وضبط کی پابندی، علامات وقف ووصل کی درجہ بندی کی توضیح، آیات وفواصل (شمار آیات) کی تعیین اور سجدات تلاوت کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ مزید برآں قاری کی سہولت کے لئے سورتوں کے نام اور ہر سورت کے نام کے ساتھ کچھ تعارفی معلومات (مثلاً مکی و مدنی کا بیان)، مختلف تقسیمات (مثلاً اجزاء، احزاب اور رکوعات) کی تصریحات اور ہر صفحے پر حوالہ کی آسانی کے لئے بعض علامتی اشارات بھی درج کئے جاتے ہیں۔

۲۔ تاہم مذکورہ بالا امور میں سے بیشتر کی حیثیت محض اضافی معلومات کی ہے۔ دراصل صحت کتابت کا معیار اور اس کی بنیاد تو علم الرسم ہے اور صحت قراءت کا دارو مدار بڑی حد تک علم الضبط پر ہے۔ علم الرسم، جسے مرسوم المصاحف، مرسوم الخط، ھجاء المصاحف، الرسم العثمانی، رسم المصحف، الرسم المصحفی، رسم قرآنی، قرآنی رسم الخط اور بعض دفعہ اختصاراً صرف رسم الخط بھی کہتے ہیں[1] اس سے مراد کلمات قرآن کا وہ نظام املاء اور طریق ھجاء ہے جو مصاحف عثمانی میں اختیار کیا گیا تھا (یعنی الخط المرسوم فی المصاحف العثمانیۃ[2]۔ یہ مخصوص رسم الخط کتابت قرآن میں اصل جوہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآنی علوم میں اسے ایک نہایت اہم بلکہ بنیادی علم کا درجہ حاصل ہے۔ خود اسی علم کے

قواعد اور اصول کے استنباط' اس کی تاریخ اور اس کے مصادر و مراجع اور اس کے التزام یا عدم التزام سے پیدا ہونے والے مسائل وغیرہ کے بارے میں مستقل تالیفات اور متعدد علمی و تحقیقی مقالات موجود ہیں۔ اتفاق سے بعض عوامل اور اسباب کی بنا پر یہ (رسم عثمانی) طباعت قرآن کے ضمن میں اس وقت بہت سے اسلامی ممالک کا ایک زندہ اور توجہ طلب مسئلہ بھی بن گیا ہے۔ اور بعض ناقص معلومات اور غلط تعصبات اس مسئلے کو الجھانے کا باعث بن رہے ہیں۔ تاہم اس وقت ہمارا موضوع بحث یہ (علم الرسم) نہیں بلکہ علم الضبط ہے جو علم الرسم کا ہی ایک تتمہ اور تکملہ ہے۔ یہاں ابتداء میں علم الرسم کے بارے میں یہ چند تمہیدی کلمات بھی اس لئے لکھے گئے ہیں کہ آگے چل کر اسی مقالہ میں بعض مقامات پر ہمیں حوالے کے طور پر اس کا ذکر کرنا پڑے گا۔

۳۔ اگر علم الرسم کا موضوع قرآن کا ھجاء اور املاء ہے تو علم الضبط کا موضوع وہ علامات و نشانات (مثل حرکات' سکون' مد و شد وغیرہ) ہیں [۳] جو کلمات قرآن کے درست تلفظ اور ان کی نطقی کیفیات کے تحفظ میں مدد دیتے ہیں۔ یہ "مدد" والی بات ہم نے اس لئے کی ہے کہ قرآن کریم کی صحیح قراءت اور اس کے کلمات و اصوات کے درست تلفظ کی تعلیم کا اصل طریقہ تو تلقی اور سماع کا ہے جو آنحضرت ﷺ سے آج تک معمول بہ چلا آتا ہے۔ تنہا علامات ضبط یعنی علم الضبط استاد یا "شیخ" کا بدل کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ضبط کی بعض خاص صورتوں میں علامات کی وضاحت کرنے کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا جاتا ہے کہ صحیح تلفظ استاذ (شیخ) سے شفوی طور پر سیکھا جائے [۴] تاہم قراءت قرآن کی تعلیم کے دوران اور تعلیم کے بعد روزانہ تلاوت قرآن کے لئے کسی صحیح کتابت والے مصحف (نسخہ قرآن) کی ضرورت ہر مسلمان کو پڑتی ہے اور اس مقصد کے لئے کتابت کی صحت' علم الضبط کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۴۔ علم الضبط کی تاریخ اور اس کے ارتقاء کی بات کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تین اصطلاحات کی وضاحت کر لی جائے جو کتابت مصاحف کے ضمن میں اکثر استعمال ہوتی ہیں۔ اور جو عموماً "ضبط" کے ہم معنی یا "ہم مقصد" ہیں اور وہ یہ ہیں : (۱) نَقْط (۲) شَکْل اور (۳) اِعجام۔

☆ "**نَقْط**" کے لغوی معنی تو کسی حرف پر نقطہ لگانا ہے۔ لیکن اصطلاحاً اس سے مراد وہ "نظامِ نقاط" ہے جو ہمارے موجودہ نظام حرکات کا پیشرو تھا اور جسے مشہور تابعی ابو الاسود الدؤلی (۵) نے کلمات قرآن کے جزوی ضبط کے طور پر ایجاد کیا تھا اور جس میں حرکات اور دیگر علامات ضبط کا کام نقطوں سے لیا جاتا تھا (جس کا قصہ ابھی آگے بیان ہوگا)۔

☆ "**شَکْل**" کے لفظی معنی جانور کے پاؤں میں زنجیر ڈالنے کے ہیں۔ مگر اصطلاحاً کلمات کو علامات اور حرکات سے مقید کرنا مراد ہوتا ہے۔ اور اگرچہ "شکل" کا لفظ "ضبط" کی کسی بھی صورت کے لئے استعمال ہوتا ہے تاہم زیادہ تر شکل سے مراد ضبط کلمات کا وہ طریقہ لیا جاتا ہے جو الخلیل بن احمد الفراھیدی نے ایجاد کیا تھا (اس کا بیان بھی آگے آرہا ہے)۔ جس عبارت کے ہر ہر حرف پر حرکات اور علاماتِ ضبط ڈالی گئی ہوں اسے "مشکول عبارت" کہتے ہیں۔

☆ "**اِعجام**" کا اصل مطلب بھی کسی حرف پر نقطہ یا نقطے ڈال کر اسے دوسرے مشابہ حرف سے متمیز کرنا ہے۔ مثلاً د/ذ یا ت/ث وغیرہ۔ چونکہ یہ بھی "نقط" ہی کی ایک صورت بنتی ہے لہٰذا دونوں میں فرق کرنے کے لئے ابوالاسود والے طریق نقط کو "نقط الشکل" یا "نقط الاعراب" کہتے ہیں اور دوسرے کو "نقط الاعجام" کہتے ہیں۔ اگرچہ بعض قدیم مولفین نے اعجام کے لئے مطلقاً نقط کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے (۶)

☆ ضبط کی اصطلاح ان تینوں اصطلاحات کے بعد وجود میں آئی۔ علم الضبط میں عموماً نقط اور شکل کے قواعد سے بحث کی جاتی ہے اور اعجام کا ذکر اس میں کم ہی کیا جاتا ہے۔ تاہم تاریخی عمل کے لحاظ سے اعجام بھی "تحریک ضبط قرآن" کا ہی ایک حصہ تھا اور اس کا ذکر اسی مناسبت سے اس مقالہ میں اپنی جگہ پر آئے گا (۷) اور اسی تحریک کے اسباب و دواعی یعنی علم الضبط کی ضرورت اور اسکے ارتقاء کا جائزہ ہی اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے۔

۵۔ اس بات کو حوالوں سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا اور ابتداء ہی سے عربی میں ہی لکھا گیا۔ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہی صحابہؓ کی بڑی تعداد نے آنحضور ﷺ کی بتائی ہوئی ترتیب اور طریق تلاوت کے

مطابق پورا قرآن حفظ کر لیا تھا۔ قرآن کریم کا ہر ہر لفظ نزول وحی کے جلد ہی بعد لکھ بھی لیا جاتا تھا۔ قرآن کریم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو رسول کریمؐ کی زندگی میں حفظ نہ کر لیا گیا ہو اور لکھ نہ لیا گیا ہو۔

۶۔ قرآن کریم کی یہ (عہد نبوی میں) کتابت عربی خط میں تھی۔ اس وقت تک عربی زبان کی ابجد بنیادی طور پر اور تعلیم کتابت کی حد تک' صرف اٹھارہ حروف پر مشتمل تھی۔ بلکہ متصل لکھنے کی صورت میں حروف کی یہ بنیادی شکلیں صرف پندرہ ہی رہ جاتی تھیں۔ حروف کی یہ اٹھارہ یا پندرہ صورتیں اٹھائیس آوازوں کے لئے استعمال ہوتی تھیں [۸] کیونکہ ان حرفوں میں سے اکثر کی ایک سے زائد آوازیں تھیں۔ (انگریزی H.G.C. یا S کی طرح) مثلاً "ب" ب ت اور ث کے لئے اور "ح" ج ح اور خ کے لئے۔ بلکہ بعض حرفی رموز پانچ آوازوں تک کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ مثلاً ایک نبرہ (دندانہ) " ـــ " ی ب ت ث ن اور ی کے لئے استعمال ہوتا تھا صرف چھ حروف "ا ک ل م و اور ہ" ایسے تھے جو اپنی صرف ایک ایک آواز رکھتے تھے۔ عرب کے لکھے پڑھے لوگ اپنے علم زبان کی بناء پر مختلف حروف کی مطلوبہ آواز پہچان کر پڑھ سکتے تھے مثلاً لفظ "حرب" کو حسب موقع حرب (جنگ)' حرث (کھیتی)' جرب (خارش)' حزب (گروہ) یا خرب (ویرانہ) اسی طرح بآسانی پڑھ لیتے تھے جیسے ایک انگریزی دان حسب موقع G یا S یا H کی درست آواز جان لیتا ہے یا عبارت میں Lead اور Read کی قسم کے الفاظ کا مطلوبہ درست تلفظ سمجھ جاتا ہے۔ بلکہ ہمارے ہاں پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد تک بھی محکمہ مال کے ریکارڈ میں بے نقط کلمات اور وہ بھی بخط شکستہ (جس سے واقف ہونا انگریز آئی سی ایس کے لئے بھی ضروری ہوتا تھا) لکھنے اور پڑھنے کا رواج عام تھا۔ مگر پاکستانی شہزادے اس روایت کو برقرار نہ رکھ سکے۔

۷۔ عہد نبویؐ کے بعد عہد صدیقیؓ میں سرکاری اہتمام سے "اُمّ" یا ماسٹر کاپی کے طور پر قرآن کریم کا ایک نسخہ تیار کیا گیا جسے "مصحف" کا نام دیا گیا اور اس کے بعد سے لفظ مصحف بمعنی نسخۂ قرآن استعمال ہونے لگا۔ [۹] عہدِ عثمانی میں اسی ماسٹر کاپی (مصحفِ صدیقی) سے صحابہؓ کے ایک بورڈ کی زیرِ نگرانی (کم از کم) چھ مصاحف پر مشتمل ایک نیا قرآنی

ایڈیشن تیار کیا گیا۔ ان میں سے ایک مصحف حضرت عثمانؓ نے اپنی ذاتی نگرانی میں رکھا اور ایک ایک مصحف مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ اور دمشق کی مرکزی مساجد میں پبلک کے استفادہ کے لئے رکھا گیا تاکہ لوگ ان نسخوں سے اپنے لئے ذاتی مصاحف تیار کرا سکیں، کیونکہ اب یہی مصاحف باجماع صحابہؓ امت کے لئے صحت کتابت کا معیار قرار دیئے گئے تھے۔ ان مصاحف کی تیاری ایک معروف واقعہ ہے اور اس کی تفصیلات اس وقت موضوع بحث بھی نہیں۔ البتہ ہمارے موضوع کی مناسبت سے ان مصاحف کے ضمن میں دو باتیں قابل ذکر ہیں :

☆ اولاً : یہ کہ ان مصاحف کی کتابت بھی عربی حروف کی ان اٹھارہ صورتوں کے ساتھ ہوئی تھی یعنی ان میں حرکات تو درکنار، مشابہ حروف کو متمیز کرنے کے لئے نقطے بھی نہیں لگائے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عہد رسالت میں بلکہ قبل از ظہور اسلام بھی بعض حروف پر کبھی کبھار نقطے استعمال کر لئے جاتے تھے۔[۱۰] تاہم کاتبین مصاحف عثمانی نے ان نسخوں (مصاحف) میں حرفوں کو نقطوں سے بھی مطلقاً عاری رکھا۔ اکثر اہل علم کے نزدیک یہ تجرید اور تعریہ عمداً اور دانستہ تھا اور اس سے کوئی حکمت اور مصلحت (مثلاً احتمال القراءتین) وابستہ تھی۔ جب کہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ اس زمانے میں شائع عام طریق کتابت کا ایک مظہر تھا[۱۱]۔ بہرحال وجہ جو بھی تھی یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ یہ مصاحف نقط اور اعجام سے معرّیٰ تھے اور اسی لئے ہر ایک نسخہ کے ساتھ پڑھانے والا ایک مستند قاری معلم بھی بھیجا گیا تھا[۱۲]۔

☆ ثانیاً : یہ کہ یہی مصاحف عثمانی اس وقت سے لے کر آج تک دنیا بھر میں موجود مصاحف (قرآنی نسخوں) کی اصل ہیں۔ قرآن کریم کا ہر نسخہ بنیادی رسم الخط (Spelling) کی حد تک ان مصاحف عثمانی میں سے کسی ایک یا ان سے ہو بہو نقل کردہ کسی ایک نسخے کے عین مطابق ہوتا ہے اور ہونا چاہئے۔ اسی کو رسم عثمانی کا التزام کہا جاتا ہے جو درحقیقت "رسم عہدِ نبویؐ" کا التزام ہے[۱۳]۔

ان چھ نسخوں (مصاحف) میں سے کوئی اس وقت دنیا میں موجود ہے یا نہیں، یہ ایک متنازعہ معاملہ ہے۔ لیکن ان چھ نسخوں کی صوری کیفیات، ان کی املائی خصوصیات اور

بعض جزوی اختلافات کے بارے میں اتنے دقیق تقابلی ملاحظات تک کی اتنی تفصیلات ہم تک پہنچی ہیں کہ اگر آج کہیں ان نسخوں میں سے کسی ایک کی موجودگی کا دعویٰ کیا جائے [۱۴] تو اس کی صحت یا عدم صحت کو ان تفصیلات کی روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے۔ کتابت مصاحف میں ان نسخوں کے رسم الخط اور طریق ھجاء سے کوئی ادنیٰ سا اختلاف بھی اہل علم کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ [۱۵]

۸۔ حضرت عثمانؓ کے ایڈیشن یعنی مصاحف کی تیاری کے قریباً چالیس سال بعد تک دنیائے اسلام میں قرآن کریم کی کتابت اسی طرح بغیر نقاط اور بغیر حرکات کے جاری رہی [۱۶]۔ تاہم قرآن کریم کی تعلیم کے عہد رسالت سے ہی محض تحریر کی بجائے تلقی اور سماع پر مبنی ہونے کے باعث اس کی قراءت اور تلاوت عموماً درست ہی رہی۔ بالکل ایسے ہی جیسے انگریزی میں Put یا Cut اور Food یا Foot کی قسم کے لفظوں میں تلفظ کا فرق معلم کی شفوی تعلیم پر منحصر ہے نہ کہ طریق املاء اور ھجاء پر۔

۹۔ پہلی صدی ہجری کے نصف آخر تک لاکھوں غیر عرب بھی اسلام میں داخل ہو کر قرآن بلکہ عربی زبان بھی سیکھ رہے تھے۔ کسی زبان کی صرف قراءت کی تعلیم بلکہ اس کا عام بول چال میں استعمال تک بھی کسی آدمی کو اہل زبان کی سی مہارت عطا نہیں کر سکتا۔ عراق، شام اور مصر اس وقت تک اگرچہ بڑی حد تک عربی بولنے والے علاقے بن چکے تھے مگر عوام میں جہاں لحن کے ساتھ۔ یعنی غلط سلط۔ عربی بولنے کا رواج بڑھا وہاں ساتھ ہی قرآن کریم کی تلاوت میں بھی اس "غلط سلط عربی دانی" کا مظاہرہ ہونے لگا۔ آج بھی صرف وارجہ یعنی عوامی زبان بولنے والے ناخواندہ عرب قرآن خوانی میں ایسی غلطیاں عام کر جاتے ہیں۔

☆ اس وقت اہل علم کے ساتھ خود بعض مسلمان حکمرانوں کو بھی اس کے تدارک کا خیال پیدا ہوا۔ اپنی سیاسی خود غرضیوں یا گمراہیوں کے باوجود ابھی تک حکمران قرآن کریم کی درست قراءت کو نہ صرف اپنے ایمان اور اسلام کا بلکہ اپنے اہل زبان ہونے کا لازمہ سمجھتے تھے۔ اور قرآن کریم کا غلط پڑھنا نہ صرف سخت گناہ بلکہ عربی دانی کا عیب متصور ہوتا تھا۔ زبان میں اس لحن (غلط استعمال) کے تدارک کی کوششوں کے نتیجہ میں

ایک طرف علمِ نحو وجود میں آیا اور دوسری طرف نقطِ مصاحف کا عمل ظہور میں آیا۔
(جاری ہے)

حواشی

۱۔ غانم ص ۵۷۔۱۵۵۔
۲۔ تلخیص ص ۵۔
۳۔ الطراز ورق ۲/ب .
۴۔ مثلاً مصحف الجماھیریہ (ص : ل وم ون) من التعریف بالمصحف نیز دیکھئے المحکم ص ۴۸۔ الطراز ورق ۲۲/الف اور مصحف الحلبی ص ۵۲۶
۵۔ تمام کتابوں میں یہ لفظ اسی طرح "الدؤلی" (بضم الدال وفتح الھمزہ) لکھا جاتا ہے صرف الدانی کی کتاب النقط مطبوعہ دمشق میں اسے "الدئلی" (بضم الدال وکسر الھمزۃ) لکھا گیا ہے جو غالباً تسامح ہے۔
۶۔ مثلاً ابن درستویہ ص ۵۳ بعد
۷۔ نیز دیکھئے غانم ص ۹۰۔۴۸۹ اور المحکم (مقدمہ محقق) ص ۲۷۔۲۶
۸۔ ابن درستویہ ص ۶۶، الخلیفہ ص ۱۲ اور المورد ص ۲۲۳۔
۹۔ مصحف کی جمع مصاحف بمعنی نسخہ ہائے قرآن استعمال ہوتی ہے اور اس غرض کے لئے لفظ قرآن کو بصیغۂ جمع استعمال کرنا غلط ہے۔ جس کی مثالیں انگریزی میں شمل، آربری اور لنگز کے ہاں اور فارسی میں فضائلی اور عبدالمحمد خان وغیرہ کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ (یعنی Korans یا "قرآن ھا" لکھنا)۔ جمع کی غرض سے لفظ مصاحف ہی استعمال کرنا چاہئے۔
۱۰۔ صفدی ص ۱۳، الجبوری ص ۱۵۵، المنجد ص ۱۲۶ اور غانم ص ۴۶۸
۱۱۔ غانم ص ۵۵۳۔ نیز دیکھئے اسی کا ص ۷۲۔۷۱، ۴، تفصیلی بحث کے لئے۔
۱۲۔ حق التلاوۃ ص ۱۴۴
۱۳۔ غانم ص ۴۶۷
۱۴۔ دیکھئے المنجد ص ۵۰ بعد۔ نیز "مجلہ الکلیہ" ص ۳۲۴
۱۵۔ لنگز (۱) : ص ۱۱
۱۶۔ الزنجانی ص ۸۹، الجبوری ص ۱۵۸۔ الکردی ص ۹۳ وغانم ص ۵۳۹ بعد۔

سیرت و سوانح

امام ابو بکر محمدؒ بن عبداللہ بن العربی رحمۃ اللہ علیہ

—— عبدالرشید عراقی ——

امام ابو بکر محمد بن عبداللہ بن العربی کا شمار مشہور محدثین کرام میں ہوتا ہے۔ تاریخ میں ان کو "ابن العربی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اہل سیر نے ان کے علمی تبحر کا اعتراف کیا ہے اور ان کو علامہ، حافظ، متبحر، احد الاعلام، علوم و معارف میں متقدم، انواع علوم میں بحث کرنے والا، جامع کمالات، صحیح و ثواب میں امتیاز کرنے والا اور ثاقب الذہن لکھا ہے۔ اہل سیر کا متفقہ بیان ہے کہ

"علمائے مغرب میں مشرق کی سیاحت کرنے والوں میں ان سے زیادہ علم سے مالا مال ہو کر آنے والا کوئی اور شخص نہیں تھا"۔ (۱)

امام ابن العربی کی کنیت ابو بکر اور ابن العربی لقب تھا۔ شجرہ نسب محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن احمد ہے۔ (۲)

<u>ولادت</u> : ۲۲ / شعبان ۴۶۸ھ ان کی تاریخ ولادت ہے اور ان کا جائے ولادت اشبیلیہ ہے۔ (۳)

<u>خاندان</u> : امام ابن العربی کا خاندانی تعلق یمن کے قبیلہ معافر سے ہے۔ اس لئے ان کو معافری بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے والد ابو محمد عبداللہ بن محمد کا شمار اشبیلیہ کے ممتاز علماء و رؤسا میں ہوتا تھا۔ علمی و دنیاوی وجاہت سے مالا مال تھے۔ فقہ و ادب اور شعر و سخن کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ دولت عبادیہ میں ان کو بڑا رسوخ حاصل تھا۔ بنو عباد کی طرف سے بعض اعلیٰ مناصب پر فائز رہے۔ جب بنو عباد پر زوال شروع ہوا تو یہ اپنے لڑکے ابو بکر کے ساتھ بلادِ مشرق کی سیاحت کیلئے تشریف لے گئے۔

۴۹۳ھ میں عبداللہ کا مصر میں انتقال ہوا۔ (۴)

اساتذہ و تلامذہ : ان کے اساتذہ و تلامذہ کی فہرست حافظ ذہبی نے اپنی کتاب تذکرۃ الحفاظ میں درج کی ہے۔ ان کے تلامذہ میں قاضی عیاض مالکی کا نام بھی ملتا ہے (۵)

تحصیل علم : امام صاحب نے پہلے اپنے وطن میں اساطین فن سے تعلیم حاصل کی۔ (۶)

رحلت و سفر : ۱۷ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ بلادِ مشرق کی سیاحت کے لئے روانہ ہوئے اور شام، بغداد، مصر، اسکندریہ اور حجاز تشریف لے گئے اور ان مقامات پر ارباب کمال اور ائمہ فن سے استفادہ کیا۔ (۷)

علم و فضل : امام ابن العربی کا شمار اُندلس کے نامور محدثین میں ہوتا ہے۔ اہل سیر نے لکھا ہے کہ ان کی بدولت حدیث و اسناد کا علم اُندلس پہنچا اور ان کے ذریعہ حدیث کے علم کو بڑا فروغ ہوا۔ وہ بڑے کثیر الروایت اور حافظ حدیث تھے اور علمِ حدیث میں ان کے تبحر علمی کا ائمہ فن نے اعتراف کیا ہے۔ (۸) فقہ اور اصول فقہ میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ اصول فقہ اور فن خلاف کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ابن العربی مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے۔ تفقہ و اجتہاد میں صاحب کمال ہونے کی بنا پر اشبیلیہ کے قاضی مقرر ہوئے (۹) علمِ تفسیر اور علوم قرآنی میں بھی یگانہ روزگار تھے۔ ان علوم کے علاوہ ادب، بلاغت، کلام، نحو اور تاریخ میں بھی ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ شعر و سخن کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے اور کبھی کبھار خود بھی فی البدیہہ اشعار کہتے تھے۔ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے بستان المحدثین میں ان کے متعدد اشعار نقل کئے ہیں۔

فقہی مذہب : امام ابن العربی امام مالک کے فقہی مسلک سے وابستہ تھے۔ (۱۰)

اخلاق و عادات : سیرت و شمائل اور اخلاق و عادات میں ممتاز تھے۔ اپنے حسن اخلاق اور عمدہ خصائل و عادات کی وجہ سے وہ لوگوں میں نہایت مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ (۱۱)

درس و تدریس : بلادِ مشرق کی سیاحت اور تحصیل علم کے بعد اپنے وطن اشبیلیہ واپس آئے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو ان کی ذات مرجع خلائق بن گئی۔ لوگ دُور دُور سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے استفادہ کرتے۔ محکمہ قضاء

کی ذمہ داری بھی نبھاتے' درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے اور تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے۔ انہی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے وہ نہایت مقبول اور مشہور ہو گئے تھے۔ (۱۲)

زہد و عبادت : زہد و عبادت' تقویٰ و طہارت' امانت و دیانت اور عدالت و ثقاہت کے جامع تھے۔ حافظ ابن کثیر نے ان کو زاہد و عابد لکھا ہے (۱۳) اس کے ساتھ ساتھ بڑے فیاض اور سخی بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو علم و فضل کی طرح دنیوی وجاہت اور دولت و ثروت سے بھی نوازا تھا۔ صدقہ و خیرات میں پیش پیش رہتے تھے' رفاہی کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے تھے اور اس پر زرِ کثیر صرف کرتے تھے۔ اشبیلیہ کی فصیل کہنہ انہوں نے اپنے خرچ سے تعمیر کرائی۔ جُود و سخا کی وجہ سے لوگ ان کے گرویدہ تھے۔ (۱۴)

وفات : امام ابن العربی نے ۵۴۳ ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۷۵ سال تھی۔ (۱۴)

تصنیفات : امام ابن العربی نے تفسیر' علوم قرآنی' حدیث' ادب' بلاغت' علمِ کلام' نحو اور تاریخ پر مفید اور علمی کتابیں لکھیں۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ان کی ۷۳ کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ (۱۵) آپ کی مشہور کتابیں درج ذیل ہیں :

۱) فن تفسیر اور قرآنی علوم

۱) انوار الفجر (۲۰ جلد)　　۲) احکام القرآن (۲ جلد' مطبوع)
۳) الناسخ والمنسوخ　　۴) قانون التاویل

(مؤخر الذکر دونوں کتابیں فن تفسیر سے متعلق ہیں اور قرآنیات کے موضوع پر عمدہ خیال کی جاتی ہیں)۔

۲) حدیث اور متعلقات حدیث

۱) کتاب ترتیب المسالک　　۲) کتاب القبس

(یہ دونوں کتابیں موطا امام مالک کی شروح ہیں)

۴) عارضۃ الاحوذی

یہ جامع ترمذی کی مشہور شرح ہے۔ اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ امام جلال الدین سیوطی کے زمانہ تک اس کے علاوہ ترمذی کی کوئی مکمل شرح متداول نہ تھی۔ سیوطی فرماتے ہیں :

لا نعلم انه شرحه احد كاملا الا القاضى ابوبكر بن العربى فى كتاب عارضة الاحوذى

"ہم کو ابوبکر بن العربی کی عارضۃ کے علاوہ ترمذی کی اور کسی کامل شرح کا علم نہیں"۔

حضرت امام عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری لکھتے ہیں :

"یہ ترمذی کی مشہور شرحوں میں ہے۔ حافظ ابن حجرؒ وغیرہ مشاہیر علمائے اسلام نے اپنی کتابوں میں اس سے استفادہ کیا ہے اور اس کے اقتباسات نقل کئے ہیں۔ (۱۶)

یہ شرح مصر سے مکمل شائع ہو گئی ہے۔

حواشی

(۱) ذہبی : تذکرۃ الحفاظ، ج ۴، ص ۹۰

(۲) ابن خلکان : تاریخ ابن خلکان، ج ۲، ص ۲۹۲۔ شاہ عبدالعزیز : بستان المحدثین، ص ۱۳۷

(۳) ابن خلکان : تاریخ ابن خلکان، ج ۲، ص ۲۹۲۔ شاہ عبدالعزیز : بستان المحدثین، ص ۱۳۷

(۴) ابن خلکان: تاریخ ابن خلکان ج ۲، ص ۲۹۲ (۵) ذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ج ۴، ص ۹۰

(۶) ابن فرحون: الدیباج المذہب، ص ۲۸۱ (۷) ابن فرحون: الدیباج المذہب، ص ۲۸۱

(۸) ذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ج ۴، ص ۹۰ (۹) ذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ج ۴، ص ۹۰

(۱۰) ابن خلکان: تاریخ ابن خلکان ج ۲، ص ۲۹۳

(۱۱) ابن خلکان: تاریخ ابن خلکان ج ۲، ص ۲۹۳

(۱۲) ابن فرحون: الدیباج المذہب، ص ۲۸۲ (۱۳) ذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ج ۴، ص ۹۱

(۱۴) ابن خلکان: تاریخ ابن خلکان، ج ۲، ص ۲۹۳

(۱۵) ضیاء الدین اصلاحی: تذکرۃ المحدثین ج ۲، ص ۳۶۷ تا ۳۷۱

(۱۶) عبدالرحمٰن مبارکپوری، مقدمہ تحفۃ الاحوذی، ص ۸۴، ۸۵

تعمیر شخصیت اور فلاح انسانیت

سید توقیر حسین شاہ

انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں' انفرادی اور اجتماعی۔ انفرادی حیثیت میں فقط اس کی اپنی ذات سے متعلق معاملات ہیں اور اجتماعی حیثیت سے اس کے ساتھ معاشرہ میں بسنے والے دوسرے افراد بھی شامل ہیں۔ اسی طرح تعمیر شخصیت کے لئے صرف کسی ایک شخص کی تشکیل و تربیت پر بحث ہوتی ہے اور فلاح انسانیت کے حوالے سے پوری نسل انسانی کی فلاح سے متعلق معاملات زیر غور آتے ہیں۔ تعمیر شخصیت کا پروگرام مرتب کرنا کوئی آسان کام نہیں' سب سے پہلے تو پروگرام ایسا ہونا ضروری ہے کہ جس میں ایک طرف فرد اور پوری انسانیت کی پہلو بہ پہلو تعمیر کی زیادہ سے زیادہ گنجائش اور دوسری طرف ان دونوں میں ایسا خوبصورت توازن ہو کہ ان میں سے کسی ایک کی وجہ سے دوسرے کی تہذیب و ترقی کو نقصان نہ پہنچے۔[1] لہٰذا شخصیت اور معاشرے کی تشکیل کے لئے کوئی نہ کوئی فلسفہ حیات اشد ضروری ہے ورنہ زندگی سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو جائے گا۔[2] چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی ذات بابرکات نے ایسا نظام حیات تجویز فرمایا جو مختصر اور آسان ہونے کے ساتھ ساتھ اتنا جامع ہے کہ انفرادی اور اجتماعی کردار کی تعمیر کا کوئی گوشہ اس سے باہر نہیں۔ اسی لئے اللہ رب العزت نے حضور ﷺ کی ذات کو پوری نوع انسانی کے لئے نمونہ قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا :

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ (الاحزاب : ۲۱)

تمام انبیاء و رسل کی طرح حضور ﷺ بھی پیغام مجسم تھے۔ آپؐ چلتا پھرتا قرآن تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں :

"نبی پاک ﷺ کا خلق قرآن تھا"۔[3]

نبی اکرم ﷺ کی ذات ہر شخص کے لئے سورج کی روشنی کی مانند ہے جس کی مدد سے

ہر شخص اپنے صحیح اور سیدھے راستے کا تعین کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :

﴿ یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا○ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا○ ﴾ (الاحزاب : ۴۵،۴۶)

"اے نبی! بے شک ہم نے آپؐ کو شاہد، خوشخبری دینے والا اور متنبہ کرنے والا بنا کر بھیجا اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور چمکا دینے والا چراغ"۔

لہٰذا ایک مثالی شخصیت کی تعمیر اور پوری انسانیت کی فلاح کے لئے نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو اپنانا اور آپؐ کی اطاعت لازمی امر ہیں۔ قرآن مجید میں آپؐ کی اطاعت کا حکم دیتے ہوئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا :

﴿ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ○ ﴾ (آل عمران : ۱۳۲)

"اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے"۔

اب ہم تعمیر شخصیت اور فلاح انسانیت پر الگ الگ گفتگو کرتے ہیں۔

تعمیر شخصیت

انسانی شخصیت نفسیاتی و بدنی دونوں حصوں سے مرکب ہے[۴] لہٰذا تعمیر شخصیت کا پروگرام ایسا ہونا چاہئے جو دونوں سمتوں سے رہنمائی فراہم کرتا ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ سے ہمیں دونوں سمتوں سے رہنمائی حاصل ہوتی ہے، یعنی :

☆ انسانی نفسیات یا فکر کی تعمیر

☆ بدنی لحاظ سے عمل کی ترغیب

انسانی نفسیات یا فکر میں روح اور عقل دونوں شامل ہیں۔ انسانی شخصیت میں روح کو اولیت حاصل ہے اور اس کے بعد عقل کا درجہ ہے[۵] ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے روح پھونک رکھی ہے جس کے ذریعے اسے روشنی اور قوت حاصل ہوتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے :

﴿ فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ ﴾ (الحجر : ۲۹)

"جب میں اس کو ٹھیک کرلوں اور اپنی طرف سے اس میں روح پھونک دوں"۔

روح سے روشنی اور قوت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے سنبھال کر رکھا جائے۔ ہر روح فطری طور پر اللہ کی محبت سے آشنا اور اللہ کے قرب کی جویا ہے[۶] روح کا جسم کے ساتھ رابطہ بذریعہ قلب ہے۔ اس لئے ہر قلب میں اللہ تعالیٰ کے وجود کا احساس اور اس کی طرف بڑھنے کی امنگ موجود ہے۔[۷] قلب گویا چراغ اور پھر اس چراغ کا تیل یادِ الٰہی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :

﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ (الرعد : ۲۸)

"خبردار! اللہ کا ذکر دلوں کو اطمینان بخشتا ہے"۔

جب روح اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے ذکر سے جلا پاتی ہے تو اسے خوف صرف محبوب کی ناراضگی اور ناخوشنودی کا رہ جاتا ہے اور اس کی امید بھی صرف اللہ ہی سے وابستہ رہ جاتی ہے کیونکہ اس پر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اس کائنات میں حکم صرف اللہ ہی کا چلتا ہے۔[۸] لہٰذا تعمیر شخصیت کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ روح کو چمکا کر رکھا جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝ ﴾

(الشمس : ۹،۱۰)

"بے شک مراد کو پہنچا جس نے اسے ستھرا کیا۔ اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا"۔

انسانی جسم میں روح کی تقویت کے لئے عقل موجود ہے جو روح کے تاثرات کو دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرتی ہے اور انہیں حکمت کے ساتھ عمل میں لانے کا راستہ وضع کرتی ہے۔[۹] عقل کی حیثیت دراصل خادم کی ہے۔ جس چیز کو اپنا مقصد قرار دیں عقل اسی کے لئے دلائل اور تجاویز پیش کرتی ہے۔ اسی لئے اسلام نے عقلی قوت کی تربیت کے لئے نتیجہ خیز استدلال اور معرفت کا ذریعہ اختیار کیا اور تخلیق کائنات میں غور و فکر کی دعوت دے کر انسانی عقل کو خدا کی معرفت سے روشناس کرایا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :

﴿ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○ ﴾ (آل عمران : ۱۹۰)

"بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور رات اور دن کے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں"۔

چنانچہ دین اسلام میں روح اور عقل کی بہتری کے لئے صحیح سمت تجویز کرنے کے بعد ان کی بالیدگی اور ان میں چمک پیدا کرنے کے لئے انسانی نفسیات یا فکر میں مندرجہ ذیل عقائد کے تحت تعمیر شخصیت کی بنیاد رکھی گئی۔

عقیدۂ توحید : توحید کا مطلب ہے کہ خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا :

﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ یَلِدْ ○ وَلَمْ یُوْلَدْ ○ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ○ ﴾ (الاخلاص)

"اے محبوب کہہ دیجئے اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں"۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: "اے معاذ کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر کیا حق ہے؟" انہوں نے جواب دیا : اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ تو فرمایا "اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں"۔ (۱۰)

زندگی کی صحیح سمت متعین کرنے کے لئے ضابطۂ حیات ضروری چیز ہے اور ضابطہ حیات کے صحیح اور ہر قسم کے نقص سے پاک ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو وضع کرنے والا بھی بے مثال ولازوال ہو۔ لہٰذا توحید ہی ایسا تصور ہے جو اس سلسلہ میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ شخصیت کی تعمیر بھی اسی اساسی یقین پر ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ معبود ہیں اور سارے جہان کے مقابلہ میں معزز و مفتخر اور بلند و بالا ہیں اور اس ہستی کے سامنے میرا یہ سفر فقیرانہ شان سے جھک رہا ہے اور حیات و علم، رزق و فراخی، ہدایت و رشد اور عزت کی استدعا کر رہا ہے۔

عقیدۂ آخرت یا تصور جواب دہی : عقیدہ آخرت سے مراد یہ ہے کہ یہ دنیا فانی ہے اور ہر شخص کو مرنا ہے اور مر کر پھر جینا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :

﴿ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۪ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (آل عمران : ۲۵)

"پس اس وقت کیا حال ہو گا جب ہم ان کو جمع کریں گے۔ اس روز کے آنے میں کوئی شک نہیں اور ہر نفس اپنے اعمال کا پورا بدلہ پائے گا اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا"۔

چنانچہ یہی وہ عقیدہ اور اصول ہے جو افکار و اعمال کو پاکیزہ رکھتا ہے اور انسانی فکر میں تقویٰ اور احتیاط کا رویہ پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا آخرت اور جواب دہی کے تصور کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا :

"اور تم لوگ بہت جلد اپنے پروردگار سے ملو گے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کے متعلق پوچھے گا"۔ (۱۱)

انسانی ذہن اور فکر کا صحیح راستہ متعین کرنے کے بعد سیرت طیبہ سے ہمیں عمل کی ترغیب کا درس ملتا ہے۔ انسان جسد خاکی مٹی اور روح سے مرکب ہے۔ چنانچہ نہ روح بغیر جسم کے جلوہ گر ہو سکتی ہے اور نہ جسم بغیر روح کے کارگر۔ چنانچہ دنیا میں ہماری روح کے اظہار کی صورت ہمارا جسم ہے اور انسان کے عمل ہی سے اس کی روح کی پاکیزگی اور غلاظت کا پتہ چلتا ہے۔ (۱۲) اسی لئے قرآن مجید میں ایمان ـــــ جو ذہنی و قلبی کیفیت کا نام ہے ـــــ کے ساتھ ساتھ عمل صالح کا تقاضا کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے :

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾ (البقرۃ : ۸۲)

"اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہی اصحابِ جنت ہیں اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے"۔

خالق چاہتا تھا کہ کوئی اس کی تخلیق کو سمجھے، اس سے لطف اندوز ہو، اس کی داد

دے اور اس کی تخلیق کو سمجھ کر خالق کی حقیقت کو پہچان کر اس تک رسائی حاصل کرے اور اس کا قدر دان اور شکر گزار بن جائے۔ خالق سے محبت کرے اور پھر اپنے عمل سے اس کی محبت کا حق ادا کرے، مگر مجبوراً نہیں بلکہ خوشی سے۔ (۱۳) انسانی جسم سے عملی صورت میں خالق کی محبت کا حق ادا کرنے اور شکر بجالانے کے لئے سیرت طیبہ سے مندرجہ ذیل تحفے انسانیت کو حاصل ہوئے۔

نماز : نماز ایک ایسی عملی عبادت ہے جس میں انسان کا دل، دماغ اور جسم خدا تعالیٰ کی محبت اور اس کی قدر دانی کا ثبوت پیش کر رہا ہوتا ہے اور وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کر رہا ہوتا ہے۔ انسان اپنے جسم کی سب سے اعلیٰ شے یعنی اپنی پیشانی کو خدا کے سامنے زمین پر ٹکا کر اللہ تعالیٰ کی برتری کا اعلان کر رہا ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں بارہا نماز قائم کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ارشاد ہے :

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ (النور : ۵۶)

"اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے"۔

روزہ : روزہ دوسری بڑی عملی عبادت ہے۔ انسانی جسم کو صبر و شکر اور مشکلات برداشت کرنے کا عادی بنانے کا سب سے بڑا ذریعہ روزہ ہی ہے۔ یہ ایک ایسی عبادت ہے جو انسان کو دوسری بڑی اخلاقی بیماریوں یعنی جھوٹ، غیبت، حسد، بدگمانی، چوری، چغل خوری، بغض، کینہ، عداوت، لڑائی جھگڑا، جاسوسی اور چغل خوری سے نہ صرف باز رکھتی ہے بلکہ اسے خدا کی موجودگی اور قدرت کا احساس دلاتے ہوئے تقویٰ کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے :

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ (البقرۃ : ۱۸۳)

"اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم پرہیزگار بنو"۔

نبی اکرم ﷺ ماہ رمضان کے علاوہ سال کے اکثر ایام میں بھی روزے رکھتے۔ آپ کا ارشاد ہے :

((اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ)) (۱۴)

"روزہ ڈھال ہے (گناہوں سے)"

زکوٰۃ : زکوٰۃ تیسری بڑی عملی عبادت ہے۔ اس عبادت کی وجہ سے انسان دولت کی ہوس اور لالچ سے دور رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے کسی بھائی کی محتاجی دور ہو جاتی ہے اور ان دونوں میں پیار اور محبت کا رشتہ قائم رہتا ہے اور معاشرہ فلاح پاتا ہے۔

زکوٰۃ کی اہمیت کے پیش نظر جابجا اس کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے :

﴿ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ﴾

(الحج : ۷۸)

"پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کی رسی مضبوطی سے تھام لو' وہ تمہارا مولا ہے"۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ زکوٰۃ کی اہمیت کے پیش نظر لوگوں سے زکوٰۃ کی ادائیگی کی بیعت لیا کرتے تھے۔ حدیث شریف میں ہے :

"جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں' میں نے آنحضرت ﷺ سے نماز کی درستی کے ساتھ ادا کرنے' زکوٰۃ دینے اور مسلمانوں کا خیر خواہ رہنے پر بیعت کی"۔ (۱۵)

کسی شخص کی فکر میں چمک پیدا کر کے اور اس میں عملی جذبہ کو پروان چڑھانے کے بعد دوسرا مرحلہ تزکیۂ نفس اور عمل کی پختگی اور دوام کا ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں سیرت طیبہ سے حاصل ہونے والے مندرجہ ذیل موتی کسی شخص کے گلے میں سجا کر اس کی شخصیت کو مثالی بنایا جا سکتا ہے۔

ضبط نفس : ضبط نفس کا مطلب ہے کہ انسان اپنے دل میں پیدا ہونے والے شیطانی وساوس کو اپنے ایمان کی قوت سے دبا کر نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنی ساری زندگی بسر کرے۔ نبی پاک ﷺ نے اسے ایمان کے ساتھ مشروط کرتے ہوئے

خونریز معرکوں میں ہر جگہ توکل و اعتماد علی اللہ کا ایک ہی جلوہ نظر آتا ہے۔[۱۹]

استقامت : سیرت طیبہ سے حاصل ہونے والا ایک اور انمول موتی جو تعمیر شخصیت کے لئے ضروری ہے وہ استقامت ہے۔ استقامت کے معنی "سیدھا رہنا" یا "سیدھے چلے چلنا" کے ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے' مشکلات اور خطرات کا مقابلہ کر کے صحیح راستہ پر ثابت قدمی سے چلا جائے۔[۲۰] حدیث شریف میں ہے :

"ایک دفعہ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم ﷺ سے اپنی مصیبتوں کا حال عرض کیا اور دعا کے لئے درخواست کی (چونکہ یہ بھی ایک قسم کی بے تابی تھی) تو آپؐ نے فرمایا تم سے پہلے لوگوں میں ایسا مرد بھی ہوا ہے جس کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور آرے سے اس کو چیر کر دو کر دیا جاتا مگر یہ عمل اس کو دین حق سے روگرداں نہ کرتا تھا اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کا گوشت ہڈیوں سے نوچ کر تار تار کر دیا جاتا مگر یہ عمل بھی اس کو اس کے دین سے نہ ہٹاتا تھا"۔[۲۱]

خود نبی اکرم ﷺ کو جب حضرت ابو طالب نے بلا کر کہا "بھتیجے تمہاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے تھے اور ایسی ایسی باتیں کہہ گئے ہیں" تو آپؐ نے ایمان افروز جواب دیتے ہوئے فرمایا "چچا جان خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں کہ میں اس کام کو اس حد تک پہنچائے بغیر چھوڑ دوں کہ یا اللہ تعالیٰ اسے غالب کر دے یا میں اسی راہ میں فنا ہو جاؤں' تو نہیں چھوڑوں گا"۔[۲۲]

احساس ندامت : احساس ندامت کسی بھی شخصیت کے اخلاق و کردار کی درستی کے لئے اہم ہتھیار ہے۔ اسی احساس کی بدولت انسان ہر گناہ سے حتی الامکان دور رہتا ہے اور بتقاضائے بشریت سہواً کوئی گناہ سرزد ہو بھی جائے تو پھر اپنے قلب اور روح کی تسکین کے لئے ہر قسم کی سزا بھگتنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اتباع و اطاعت میں گناہ سے دور رہنے کا احساس نہ ہو۔ حدیث شریف میں ہے :

"نبی پاک ﷺ کے پاس ایک چور لایا گیا جس نے چوری کا اعتراف کر لیا تھا اور

فرمایا :

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشات اس دین کے تابع نہ ہو جائیں جو میں لایا ہوں"۔ (۱۶)

بے غرضی : تعمیر شخصیت کے لئے سیرت طیبہ سے حاصل ہونے والا دوسرا انمول موتی بے غرضی ہے۔ قرآن مجید میں نبی پاک ﷺ کے اس وصف کی طرف یوں اشارہ ہوا :

﴿ قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ ﴾

(الانعام : ۱۶۳)

"کہہ دیجئے : بے شک میری نماز' میری قربانی' میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ہی کے لئے ہے جو ربِ جہان ہے"۔

ایک حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے :

"ہر شخص کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی"۔ (۱۷)

خود نبی کریم ﷺ نے ۲۳ سال تک ہر قسم کی مشکلات اور تکلیفات کا سامنا کرتے ہوئے بغیر کسی دنیاوی لالچ اور غرض کے اسلام کی تبلیغ کی حتیٰ کہ قریش مکہ کی مال اور آسائش و آرام کی پیشکش کو بھی ٹھکرا دیا۔

توکل : توکل کے معنی یہ ہیں کہ انسان کوششوں کے نتائج اور واقعات عالم کے فیصلہ کو خدا کے سپرد کر دے۔ اسباب و علل کے پردے اس کے سامنے سے اٹھ جائیں اور اس کو ہر چیز براہ راست خدا کے قبضۂ قدرت میں نظر آئے۔ (۱۸) قرآن مجید میں مومنوں کے اس وصف کا ذکر کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا :

﴿ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ (ابراھیم : ۱۱)

"اور مومن تو اللہ ہی پر توکل کرتے ہیں"۔

آنحضرت ﷺ کی زندگی کا ایک ایک حرف پڑھ لیں' صاف نظر آئے گا کہ آسمان کے نیچے شدائد اور مصیبتوں کی کوئی صنف ایسی نہ ہو گی جو آپؐ کی راہ میں حائل نہ ہوئی ہو لیکن آپؐ کا دل کبھی اضطراب اور انتشار' نا یوسی و ناامیدی اور خوف و بیم سے آشنا نہ ہوا۔ مکہ کی تنہائیوں میں' مصائب کے ہجوم میں' دشمنوں کے نرغہ میں' حنین و اُحد کے

اس کے پاس سامان نہیں پایا گیا تھا۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ تم نے چوری نہیں کی۔ کہنے لگا کیوں نہیں۔ آپؐ نے دو یا تین مرتبہ اس بات کو دہرایا لیکن وہ ہر بار اقرار کرتا تھا۔ آپؐ نے اس کے متعلق حکم دیا اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا"۔ (۲۳)

صبر: صبر کا مطلب ہے کہ نفسانی خواہشات کو عقل پر غالب نہ آنے دیا جائے۔ صبر دل کی کمزوری، بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کی حالت میں مجبور ہو کر درگزر کرنے کا نام نہیں بلکہ دل کی انتہائی قوت، ہمت کی بلندی، عزم و استقامت اور مشکلات و مصائب کو خدا کے بھروسے پر خاطر میں نہ لانے کا نام ہے۔ نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی صبر کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

"نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے راستے میں مجھے اتنا ڈرایا دھمکایا گیا کہ کسی اور کو اتنا نہیں ڈرایا گیا اور اللہ کی راہ میں مجھے اتنا ستایا گیا کہ کسی اور کو اتنا نہیں ستایا گیا۔ اور ایک دفعہ تیس رات دن مجھ پر اس حال میں گزرے کہ میرے اور بلال (رضی اللہ عنہ) کے لئے کھانے کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کو کوئی جاندار کھا سکے سوائے اس کے کہ جو بلال نے اپنی بغل کے اندر چھپا رکھا تھا"۔ (۲۴)

میانہ روی: تعمیر شخصیت کو مثالی بنانے کے لئے سیرت طیبہ سے حاصل ہونے والا ایک اور انمول موتی میانہ روی ہے۔ میانہ روی کا مطلب ہے افراط و تفریط سے بالاتر رہنا۔ کسی بھی شخص کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے اہم اصول میانہ روی ہے۔ یہ ایسا اصول ہے جو انسان کو زندگی میں اپنے اعمال و افعال میں حد سے بڑھنے سے روکتا ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"پرہیز کرو مال اور اخراجات میں بے جا صرف کرنے سے اور اعتدال اختیار کرو۔ کوئی قوم کبھی فقیر نہیں ہوتی جب تک اعتدال پر قائم رہے۔ (۲۵)

ایک جگہ ارشاد فرمایا:

((خیر الامور اوسطها))

"بہترین کام درمیانے درجے کے ہیں"۔

بردباری : بردباری کے معنی یہ ہیں کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کرلیا جائے اور قصور وار سے اس کے لئے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔(۲۶)

نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے :

"جو شخص باوجود قدرت کے غصہ کو ضبط کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعام خاص کا مستحق ٹھہرائے گا"۔(۲۷)

غزوہ اُحد میں حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والا حبشی جب آپؐ کے سامنے آیا تو آپؐ نے پوچھا کہ حمزہ رضی اللہ عنہ کو تو نے ہی قتل کیا۔ اس نے جواب دیا کہ آپؐ کو تو سب پتہ ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا کیا تو ایسا کر سکتا ہے کہ اپنا منہ مجھ کو نہ دکھلائے۔(۲۸)

شجاعت : قوت غضب کی زیادتی اور اس کے تابع عقل ہونے کو شجاعت کہتے ہیں۔ شجاعت عزم و استقلال اور حق گوئی و بے باکی کی بنیاد ہے۔ یہ ایسی صفت ہے جو کسی بھی شخص کو صحیح راستے پر چلتے ہوئے باطل کے سامنے ڈٹ جانے میں مدد دیتی ہے اور انسان دین حق کی سربلندی اور حفاظت کے لئے جان کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ نبی پاک ﷺ نے بہادری کی اہمیت و ترغیب کے لئے فرمایا :

((وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ)) (۲۹)

"اور جان لو' بے شک جنت تلواروں کے سائے تلے ہے"۔

خود سیرت طیبہ شجاعت کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

جنگ حنین میں گھات میں بیٹھے ہوئے مشرکوں نے اس قدر شدید تیر اندازی کی کہ اکثر مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے لیکن حضور ﷺ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے۔ آپؐ کے خچر کی لگام حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے پکڑی ہوئی تھی اور آپؐ باآواز بلند فرما رہے تھے :

((اَنَا النَّبِیُّ لَا كَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدِالْمُطَّلِبِ)) (۳۰)

حفظ اللسان : انسانی شخصیت کو ممتاز اور قابل قدر بنانے والی اہم خوبی جو سیرت مصطفیٰ ﷺ سے حاصل ہوتی ہے وہ زبان کی حفاظت ہے۔ زبان عقل کی نائب ہے۔ عقل و خیال میں جو کچھ آتا ہے اس کو الفاظ و عبارت کی صورت میں ظاہر کرنا زبان ہی کا کام ہے۔ جس قسم کے الفاظ و کلمات زبان سے نکلتے ہیں انہی کے مطابق کسی صفت' حرکت یا کیفیت کا

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

مولانا مودودی مرحوم کا قائم کردہ تعلیمی ادارہ۔ چند وضاحتیں

مرسلہ : مولانا عبدالغفار حسن

مکرمی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ گھٹنوں کی تکلیف کو آپریشن کے بعد پوری طرح افاقہ ہوگا۔ دو ہفتے قبل ماہنامہ "حکمت قرآن" شمارہ اگست ۹۸ موصول ہوا۔ اس میں چند باتیں تصحیح کے قابل ہیں۔

۱۔ صفحہ نمبر ۵ پر آپ نے حدیث لکھی ہے "کُنْتُ نَبِیًّا وَ آدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ" ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث ثابت نہیں ہے' بلکہ موضوع ہے۔ صحیح الفاظ یہ ہیں "کُنْتُ نَبِیًّا وَ آدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ"۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں حسب ذیل کتب :

(۱) ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، طبع مصر ج ۱۰' ص ۸۷ باب فضائل النبی ﷺ

(۲) المقاصد الحسنۃ السخاوی ص ۳۲۷' حدیث ۸۳۷

(۳) المصنوع فی الحدیث الموضوع ملا علی قاری ص ۱۱۰ حدیث ۲۳۳۔

(۴) الاسرار المرفوعہ فی الاحادیث الموضوعۃ ملا علی قاری ص ۲۷۱' ح ۳۵۲

(۵) تمییز الطیب من الخبیث عبدالرحمٰن بن علی الشیبانی ص ۱۴۶۔

کاتب صاحب نے حدیث کے بعض الفاظ درست طور پر نہیں لکھے "والطین" کو "والتین" لکھ دیا گیا۔ پروف ریڈنگ کرتے ہوئے اس قسم کی غلطیوں کی اصلاح ضروری ہے۔

۲۔ صفحہ نمبر ۳۹ پر آپ نے تحریر فرمایا ہے "بعد ازاں مولانا مودودی نے اسی طرح کی سکیم بنا کر راولپنڈی میں ادارہ قائم کیا جہاں گریجویٹس کو قرآن پڑھایا جائے اور عربی کی تعلیم دی جائے۔ اس کے لئے مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالجبار غازی

صاحب راولپنڈی منتقل بھی ہو گئے تھے لیکن اس کے بعد مولانا نے اپنی سیاسی مصروفیات اس قدر بڑھالیں کہ وہ ادارہ بھی ختم ہو گیا"۔

اس عبارت میں چند باتیں خلاف واقعہ ہیں یا کم از کم بعض واقعات کے بیان میں خلا رہ گیا ہے۔

(ا) جماعت کی مجلس شوریٰ نے جون یا جولائی ۱۹۴۸ء میں یہ طے کیا تھا کہ ایک ایسی درسگاہ قائم کی جائے جس میں گریجویٹس نوجوانوں کو دینی علوم کی تعلیم دی جائے اور درس نظامی کے فارغین کو انگلش اور جدید علوم سے واقف کروایا جائے' آپ نے صرف گریجویٹس کا ذکر کیا ہے۔

(ب) مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالجبار غازی صاحب راولپنڈی منتقل نہیں ہوئے تھے بلکہ کافی عرصے سے ان دونوں حضرات کا قیام راولپنڈی میں تھا۔

(ج) اس درسگاہ کے لئے بطور مدرس مولانا اصلاحی کا تقرر نہیں ہوا تھا' بلکہ دینی علوم پڑھانے کی ذمہ داری راقم الحروف پر ڈالی گئی تھی۔ اسی غرض کے لئے میں لاہور سے راولپنڈی منتقل ہو گیا تھا۔

(د) یہ ادارہ جولائی کے شروع میں قائم ہوا تھا۔ اس غرض کے لئے کوہاٹی بازار میں تین منزلہ عمارت ساٹھ روپے ماہوار کرایہ پر لی گئی تھی۔ اس عرصے میں صرف تین طلبہ داخل ہوئے۔ ان میں سے کوئی بھی گریجویٹ نہ تھا بلکہ انٹرپاس تھے۔ ان کے نام یہ ہیں (۱) عرفان غازی (۲) شریف کیانی (۳) چوہدری رحمت الٰہی (حال نائب امیر جماعت)

ان میں سے صرف چوہدری صاحب درس گاہ کے ہاسٹل میں مقیم تھے' پچیس روپے ماہانہ طعام کا معاوضہ ادا کرتے تھے۔ چوتھے ایک صاحب جو درس نظامی کے فارغ تھے وہ گڑھی شاہو لاہور سے آئے تھے۔ وہاں وہ ایک ہائی سکول میں پڑھاتے تھے۔ بڑے ذوق و شوق سے وہ آئے تھے لیکن جلد ہی واپس چلے گئے۔ ان کے لئے مصارف طعام برداشت کرنے مشکل تھے۔ اس عرصہ میں جماعتی حلقوں میں کہا جاتا تھا "ہم نے کیا سفید ہاتھی باندھ لیا ہے۔ اس سے کیسے چھٹکارا حاصل ہو گا۔ خرچ زیادہ ہے اور طلبہ صرف تین"۔ درس گاہ

کا عملہ کئی افراد پر مشتمل تھا۔ دو مدرس' ایک محاسب' ایک باورچی' ایک خادم' ایک چوکیدار اور ایک صفائی والا۔ آخر انجام یہ ہوا کہ ۳/ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مولانا مودودی' مولانا اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب گرفتار کر لئے گئے۔ اور مرکز میں اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے راقم الحروف اور غازی صاحب کو لاہور منتقل ہونا پڑا۔ اتنی تفصیل لکھ دی گئی ہے تاکہ پورا پس منظر واضح ہو جائے۔ یعنی یہ درسگاہ اس بنا پر ختم ہو گئی کہ مولانا اور ان کے ساتھی گرفتار کر لئے گئے تھے نہ کہ سیاسی مصروفیات بڑھانے کی بنا پر۔

والسلام

عبدالغفار حسن' اسلام آباد

بقیہ : تعمیر شخصیت اور فلاح انسانیت

ظہور دل میں ہونے لگتا ہے۔ لہٰذا زبان سے نکلنے والے کلمات بد ہوں تو دل میں بدی کی تاریکی چھا جاتی ہے اور جب زبان سے کلمات حق نکلتے ہیں تو دل میں حق کی روشنی پھیل جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے :

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِيْدًا ۝ ﴾

(الاحزاب : ۷۰)

"اے ایمان والو اللہ (کی نافرمانی) سے بچو اور سیدھی سیدھی بات کہو"۔

نبی پاک ﷺ نے زبان کی حفاظت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا :

"جو کوئی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہئے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے"۔ (۳۱)

(نوٹ : اس مضمون کے مصادر و مراجع اور حواشی دوسری قسط کے آخر میں' مضمون مکمل ہونے پر' ملاحظہ فرمائیں۔)

جَوَامِعُ الْکَلِم

محمد عربی ﷺ کا ایک عظیم الشان خطبہ، جو آپؐ نے تبوک کے میدان میں تیس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں رجب ۹ ھ میں دیا۔ "جوامع الکلم" پر مشتمل یہ خطبہ امت مسلمہ کے لئے زندگی کے تمام اجتماعی و انفرادی پہلوؤں کے اعتبار سے روشنی کا مینار ہے۔ یہ خطبہ صحیح مسلم کی ایک طویل حدیث میں مروی ہے۔

اَمَّا بَعْدُ :

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد :

فَاِنَّ اَصْدَقَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ

یقیناً سچائی میں ہر کلام سے بہتر اللہ کی کتاب قرآن مجید ہے۔

وَ اَوْثَقَ الْعُرٰی کَلِمَۃُ التَّقْوٰی

مضبوط ترین سہارا تقویٰ کا کلمہ ہے۔

وَ خَیْرَ الْمِلَلِ مِلَّۃُ اِبْرَاھِیْمَ

سب دینوں سے بہتر دین حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین (اسلام) ہے۔

وَ خَیْرَ السُّنَنِ سُنَّۃُ مُحَمَّدٍ

سب طریقوں سے بہتر محمد (ﷺ) کا طریقہ ہے۔

وَ اَشْرَفَ الْحَدِیْثِ ذِکْرُ اللّٰہِ

سب باتوں پر اللہ تعالیٰ کے ذکر کو شرف حاصل ہے۔

وَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ

سب بیانات سے بہتر قرآن مجید ہے۔

وَخَيْرُ الْاُمُوْرِ عَوَازِمُهَا

بہترین کام وہ ہے جس میں اولوالعزمی ہو۔

وَشَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا

بدترین کام بدعت (دین میں از خود نکالے ہوئے کام) ہیں۔

وَاَحْسَنُ الْهَدْیِ هَدْیُ الْاَنْبِیَاءِ

تمام راستوں سے بہتر پیغمبروں کا راستہ ہے۔

وَاَشْرَفُ الْمَوْتِ قَتْلُ الشُّهَدَاءِ

سب موتوں سے بہتر شہیدوں کی موت ہے۔

وَاَعْمَی الْعَمٰی الضَّلَالَةُ بَعْدَ الْهُدٰی

سب سے بڑھ کر اندھاپن ہدایت پانے کے بعد گمراہی ہے۔

وَخَيْرُ الْاَعْمَالِ مَا نَفَعَ

سب عملوں میں بہتر وہ عمل ہے جو نفع دینے والا ہو۔

وَخَيْرُ الْهُدٰی مَا اتُّبِعَ

بہترین ہدایت وہ ہے جس پر عمل کیا جائے۔

وَشَرُّ الْعَمٰی عَمَی الْقَلْبِ

بدترین اندھاپن دل کا اندھاپن ہے۔

وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰی

اونچا ہاتھ (دینے والا) پست ہاتھ (لینے والے) سے بہتر ہے۔

وَمَا قَلَّ وَكَفٰی خَيْرٌ مِّمَّا كَثُرَ وَاَلْهٰی

تھوڑی چیز جو کفایت بھی کرے اس سے بہتر ہے جو زیادہ ہو اور انسان کو غفلت میں ڈالے۔

وَشَرُّ الْمَعْذِرَةِ حِيْنَ يَحْضُرُ الْمَوْتُ

بدترین معذرت وہ ہے جو مرنے کے وقت کی جائے۔

وَشَرُّ النَّدَامَةِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

بدترین ندامت وہ ہے جو قیامت میں ہوگی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ لَّا يَاْتِى الْجُمُعَةَ اِلَّا دُبَرًا

بعض لوگ جمعہ میں تو آتے ہیں لیکن بہت دیر کر کے آتے ہیں

(انہیں اس روش کو ترک کرنا چاہئے)

وَمِنْهُمْ مَنْ لَّا يَذْكُرُ اللّٰهَ اِلَّا هَجَرًا

ان میں سے بعض مسلمان وہ ہیں جو کبھی کبھی خدا کو یاد کرتے ہیں۔

وَمِنْ اَعْظَمِ الْخَطَايَا اللِّسَانُ الْكَذَّابُ

سب گناہوں سے بدتر جھوٹی زبان ہے۔

وَخَيْرُ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ

بہترین تونگری دل کی تونگری ہے۔

وَخَيْرُ الزَّادِ التَّقْوٰى

سب سے عمدہ زادِ راہ (توشۂ سفر) تقویٰ ہے۔

وَرَاْسُ الْحِكَمِ مَخَافَةُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ

سب سے بڑھ کر دانائی یہ ہے کہ انسان اللہ سے ڈرتا رہے۔

وَخَيْرُ مَا وَقَرَ فِى الْقُلُوْبِ الْيَقِيْنُ

دلنشیں ہونے کے لئے بہترین چیز یقین ہے۔

وَالْاِرْتِيَابُ مِنَ الْكُفْرِ

شک پیدا کرنا کفر کی نشانی ہے۔

وَالنِّيَاحَةُ مِنْ عَمَلِ الْجَاهِلِيَّةِ

مردے پر آہ و بکا کرنا جاہلیت کا کام ہے۔

وَالْغُلُوْلُ مِنْ حَرِّ جَهَنَّمَ

خیانت کرنا عذاب جہنم کا سامان ہے۔

وَالسُّكْرُ كَيٌّ مِّنَ النَّارِ

نشہ کرنا دوزخ کی آگ کا داغ لگوانا ہے۔

وَالشِّعْرُ مِنْ اِبْلِیْسَ

(برے) اشعار کہنا یا پڑھنا شیطان کی طرف سے ہے۔

وَالْخَمْرُ جَمَّاعُ الْاِثْمِ

شراب تمام گناہوں کی جڑ ہے۔

وَشَرُّ الْمَاْکَلِ مَالُ الْیَتِیْمِ

بدترین کھانا یتیم کا مال کھانا ہے۔

وَالسَّعِیْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَیْرِہٖ

سعادت مند وہ ہے جو دوسروں سے نصیحت حاصل کرے۔

وَالشَّقِیُّ مَنْ شُقِیَ فِی بَطْنِ اُمِّہٖ

اصل بدبخت وہ ہے جو اپنے ماں کے پیٹ ہی سے بدبخت پیدا ہوا ہو۔

وَاِنَّمَا یَصِیْرُ اَحَدُکُمْ اِلٰی مَوْضِعِ اَرْبَعَةِ اَذْرُعٍ

یاد رکھو! تمہارا انجام کار چار ہاتھ کی (تنگ و تاریک) قبر ہے۔

وَالْاَمْرُ اِلَی الْاٰخِرَةِ

پھر اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔

وَمِلَاكُ الْعَمَلِ خَوَاتِمُهٗ

عمل وہ اچھا ہے جس کا انجام اچھا ہو۔

وَشَرُّ الرُّؤْیَا رُؤْیَا الْکَذِبِ

بدترین خواب وہ ہے جو جھوٹا ہو۔

وَکُلُّ مَا هُوَ آتٍ قَرِیْبٌ

جو بات ہونے والی ہے اس کو قریب سمجھو۔

وَسِبَابُ الْمُؤْمِنِ فُسُوْقٌ

مسلمان کو گالی دینا فسق ہے۔

وَقِتَالُهٗ کُفْرٌ

اس کو قتل کرنا کفر ہے۔

وَ اَكْلُ لَحْمِه مِنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ

اس کی چغلی کرنا اللہ کی معصیت ہے۔

وَ حُرْمَةُ مَالِهِ كَحُرْمَةِ دَمِهِ

مسلمان کا مال ایسا ہی حرام ہے جیسے اس کا خون بہانا حرام ہے۔

وَ مَنْ يَّتَاَلَّ عَلَى اللّٰهِ يُكَذِّبْهُ

جو شخص اللہ سے بے پرواہی کرتا ہے اللہ اسے جھوٹا ثابت کرتا ہے۔

وَ مَنْ يَّغْفِرْ يُغْفِرْ لَهٗ

جو مسلمان کسی مسلمان کا عیب چھپاتا ہے خدا اس کے عیب چھپاتا ہے۔

وَ مَنْ يَّعْفُ يَعْفُ اللّٰهُ عَنْهُ

جو مسلمان کسی کو معاف کرتا ہے اللہ اس کو معاف کرتا ہے۔

وَ مَنْ يَّكْظِمِ الْغَيْظَ يَاْجُرْهُ اللّٰهُ

جو مسلمان غصہ پی جاتا ہے اللہ اُسے اجر دیتا ہے۔

وَ مَنْ يَّصْبِرْ عَلَى الرَّزِيَّةِ يُعَوِّضْهُ اللّٰهُ

جو مسلمان نقصان پر صبر کرتا ہے اللہ اُسے معاوضہ دیتا ہے۔

وَ مَنْ يَّتَّبِعِ السُّمْعَةَ يُسَمِّعِ اللّٰهُ بِهٖ

جو مسلمان کسی مسلمان کی چغلی کھاتا ہے اللہ اُس کی رسوائی عام کر دیتا ہے۔

وَ مَنْ يَّتَصَبَّرْ يُضَاعِفِ اللّٰهُ لَهٗ

جو مسلمان صبر کرتا ہے اللہ اس کا ثواب بڑھا چڑھا کر دیتا ہے۔

وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ يُعَذِّبْهُ اللّٰهُ

جو شخص اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اللہ اسے عذاب دیتا ہے۔

وَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ ' وَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ ' وَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ

میں اللہ تعالیٰ سے (ہم سب کیلئے) بخشش اور معافی کا طالب ہوں۔ آپؐ نے تین بار استغفار کیا۔

(انتخاب : حافظ محبوب احمد خان)

صدرِ مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی علمی و فکری اور دعوتی و تحریکی کاوشوں کا نچوڑ

۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی دستاویز جس میں علمی خطوط کی نشاندہی بھی موجود ہے

دعوت رجوع الی القرآن

کا منظر و پس منظر

ضرور مطالعہ کیجئے ـــــ دوسروں تک پہنچائیے

■ سفید کاغذ ■ عمدہ کتابت ■ دیدہ زیب طباعت ■ قیمت مجلد -/۸۰ روپے ■ غیر مجلد -/۶۰ روپے

Oc 998 | Reg. No. CPL. 126
NTHLY | Vol. 17
ikmat-e-Quran
HORE | No. 10

محترم میاں محمد نواز شریف!
اور معزز ارکانِ پارلیمنٹ، جمہوریہ اسلامیہ پاکستان!

پاکستان اِس وقت اپنی تاریخ کے اہم ترین اور فیصلہ کن مرحلے سے گزر رہا ہے اور آپ حضرات ایک مشکل امتحان سے دوچار ہیں۔

- کتاب الٰہی اور سنت رسولؐ کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے کی تجویز اگر ناکام ہو گئی یا اسے واپس لینا پڑا تو یہ اللہ اور رسولؐ کے س غداری پر مستزاد علامہ اقبال اور قائد اعظم کے تصورات و اعلانات اور سب سے بڑھ کر خود پاکستان کے قیام کے مقصد کی نفی ہو گی
- لیکن اگر آئین میں پندرھویں ترمیم کی تجویز جوں کی توں منظور ہو گئی تو پاکستان یا تحلیل ہو کر ختم ہو جائے گا یا اگر باقی اور قائم رہا تو منہ وسطیٰ کے سلاطین کے عہد کی جانب اُلٹی زقند لگائے گا جو ایک دوسرے اعتبار سے قیام پاکستان کے مقاصد کی کامل نفی ہو گی یعنی عہد حاضر کی ایک مثالی اسلامی جمہوری فلاحی مملکت کا خواب ختم ہو کر رہ جائے گا۔

الغرض معاملہ ع "هشدار کہ رہ بر دم تیغ است قدم را!" والا ہے!

اس مشکل کا حل یہ ہے کہ :

۱ - مجوزہ دفعہ ۲-ب (۱) کے ساتھ ہی موجودہ دستور کی دفعہ ۲۲۷ (۱) کے الفاظ بھی شامل کر دیئے جائیں اور بقیہ پورے باب نہم و ختم جائے۔ اس لئے کہ اب فیڈرل شریعت کورٹ کی موجودگی میں اسلامی نظریاتی کونسل کی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ یہ کونسل اپنا بھی پورا کر چکی ہے (اس سے اخراجات میں بھی بچت ہو گی جو فی الوقت بہت اہم ہے)

۲ - مجوزہ دفعہ ۲-ب کی ذیلی دفعات (۳) اور (۵) کو ساقط کر دیا جائے اور (۴) کو (۳) بنا دیا جائے۔

۳ - موجودہ دستور کی دفعہ ۲۳۹ میں تجویز کردہ تمام ترامیم واپس لے لی جائیں۔

۴ - فیڈرل شریعت کورٹ اور سپریم کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بنچ کے ججوں کی شرائط ملازمت ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کے با مساوی بنا دی جائیں اور ان میں عالم ججوں کی تعداد بڑھائی جائے (جس کے ضمن میں اسلامی نظریاتی کونسل میں شامل مجتہدانہ بصیرت ر والے علماء کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے) —— اور

۵ - فیڈرل شریعت کورٹ کے دائرہ کار پر عائد جملہ تحدیدات ختم کر دی جائیں تاکہ کتاب و سنت کے ملک کے سپریم لاء ہونے کے تقاضے بتہ کمال پورے ہو سکیں۔

اس کے بعد قانون ساز ادارے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تقاضے پورے کرنے کے لئے قانون سازی کرتے رہیں گے اور انتظامیہ ان تنفیذ کرتی رہے گی۔ اور اگر کسی قانون پر کسی شہری کو اعتراض ہوا تو وہ اسے فیڈرل شریعت کورٹ میں چیلنج کر سکے گا۔ اور یوں ط تدریجاً اور ہموار انداز میں ملک میں مکمل اسلامی نظام نافذ ہو جائے گا!

الداعی الی الخیر : ڈاکٹر اسرار احمد، امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان

"اس اشتہار کی ضرورت بالخصوص اس لئے محسوس ہوئی کہ سننے میں آیا کہ بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہے کہ مجوزہ ترمیم کے مرتب کرنے میں اس عاجز کا بھی کوئی عمل دخل ہے لہٰذا عوام کے علم میں آ جانا چاہئے کہ تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت پاکستان مجوزہ ترمیم کے پہلے حصے یعنی قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے کی تو بھرپور تائید اور حمایت کرتی ہے لیکن اس میں تنفیذ شریعت کا جو طریقہ کار معین کیا گیا ہے اس کے بعض حصوں سے اعلان برأت کرتی ہے۔